انٹرویو

نگہہ بلند سخن دلنواز جاں پرسوز

• مولانا ابوبکر اصلاحی سابق صدر مدرس جامعۃ الفلاح

ملاقاتی : سید ابوالمجدی

س : مولانا آپ ہمیں یہ بتائیں کہ مولانا مرحوم سے آپ کب متعارف ہوئے ؟

ج : مولانا مرحوم کا سال پیدائش ۱۹۱۲ء ہے مولانا نے عربی تعلیم کی ابتداء مدرسۃ الاصلاح میں کی لیکن وہاں تکمیل نہیں کی بلکہ وہاں سے تعلیم چھوڑ کر ندوہ تشریف لے گئے اور فراغت وہیں سے حاصل کی آپ کا سن فراغت ۱۹۳۲ء ہے اور میرا سن فراغت ۱۹۴۲ء ہے پرائمری اور فارسی وعربی کی کچھ ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۳۵ء میں میرا داخلہ مدرسۃ الاصلاح کے عربی اوّل میں ہوا مولانا اپنے مادر علمی مدرسۃ الاصلاح میں آتے جاتے رہے اور میں نے پہلے پہل وہیں پر مولانا کو بحیثیت ایک عالم دین کے دیکھا، مولانا مرحوم کا اپنے مادر علمی میں آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہا اور ہم بحیثیت مہمان اور عالم دین دیکھتے اور جانتے رہے یہاں تک کہ جب میں درجہ عربی ششم میں پہونچا تو مولانا مرحوم مدرسۃ الاصلاح میں استاذ کی حیثیت سے تشریف لائے اور ہم نے مولانا مرحوم سے درجہ عربی ششم میں داخل نصاب کتاب "دلائل الاعجاز" پڑھی جو فن بلاغت میں ہے یہ کتاب پہلے مدرسۃ الاصلاح میں داخل نصاب تھی۔ لیکن جب علامہ فراہی مرحوم ومغفور کی کتاب "جمہرۃ البلاغۃ" شائع ہوگئی تو "دلائل الاعجاز" کو نکال کر یہی نصاب میں داخل کر لی گئی کچھ دنوں کے بعد مولانا مرحوم مدرسۃ الاصلاح سے چلے گئے میں بھی ۱۹۴۲ء میں مدرسۃ الاصلاح سے فارغ ہوگیا۔

س : مولانا مرحوم اور آپ مدرسۃ الاصلاح پر کب تشریف لائے ؟

ج : ۱۹۴۶ء میں مدرسۃ الاصلاح چند اساتذہ کی ضرورت ہوئی چنانچہ میں جامعہ رحمانیہ قادرآباد (بستی) سے مولانا صدرالدین صاحب اصلاحی پٹھان کوٹ (پنجاب) سے اور مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی مرحوم اکولہ (مہاراشٹر) سے مدرسۃ الاصلاح بحیثیت استاذ بلا لئے گئے۔

س : مولانا (مرحوم) کے ساتھ آپ لوگ جب اصلاح پر تھے تو مولانا سے آپ کے تعلقات کیسے تھے اس دوران مولانا کے رہنے سہنے کا کیا انداز ہوتا تھا ؟

ج : مولانا مرحوم ہمارے استاذ تھے اس لئے اوّلاً تو ہمارا تعلق استاذی اور شاگردی کا تھا لیکن

ہمارا تعلق رفیق کار کا بھی تھا۔ اس لئے کہ ہم دونوں مدرسۃ الاصلاح میں معلم و مربی تھے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ مولانا مرحوم بڑے طلبہ کے نگراں تھے اور میں چھوٹے طلبہ کا نگراں تھا۔ اور ہمارا تعلق امیر و مامور کا بھی تھا۔ مدرسۃ الاصلاح میں پہلے سے مولانا اختر احسن رحمۃ اللہ علیہ تنہا رکن جماعت اسلامی تھے لیکن ہم تینوں کے آجانے سے ارکان جماعت کی تعداد چار ہوگئی۔ اور ضابطے کی رو سے مقامی جماعت کی تشکیل ہوئی اور مولانا مرحوم مقامی جماعت کے امیر منتخب ہوئے۔ پورے مشرقی یو۔پی میں یہ پہلی مقامی جماعت تھی۔ جو مدرسۃ الاصلاح سرائمیر (اعظم گڑھ) میں قائم ہوئی۔ مولانا مرحوم کی زندگی بہت سادہ اور صاف ستھری تھی۔ لوگوں سے تعلقات بہت اچھے تھے۔ اساتذہ میں محترم اور طلبا میں ہردلعزیز تھے اور قرب و جوار کے تعلیم یافتہ اور معزز لوگوں سے تعلقات بہت وسیع تھے۔

س : مولانا مرحوم کے ساتھ آپ کو کہاں کہاں رہنے کا اتفاق ہوا۔ ؟

ج : مدرسۃ الاصلاح میں یا پھر جماعت اسلامی ہند کے اجتماعات میں یا (مولانا مرحوم کے زمانہ نظامت میں) جامعۃ الفلاح میں۔

س : مولانا مرحوم کی اصلاح کی زندگی کا کوئی قابل ذکر واقعہ سنائیں !

ج : تقسیم ہند کے بعد پہلی بقرہ عید آئی تو یہ ہوا گرم ہوئی کہ اس سال گائے کی قربانی نہیں ہوسکے گی، کیونکہ ملکی حالات کے پیش نظر کہیں مسلمان خوف کا شکار ہوکر اور کہیں مصلحت کے پیش نظر خود بخود گائے کی قربانی سے باز رہیں گے، چنانچہ مولانا مرحوم نے تعطیل بقرہ عید سے پہلے اساتذہ اور طلبہ پر مشتمل بہت سے گروپ بنائے، اور انھیں یہ ہدایت کی کہ اپنے اپنے ایریا میں پہونچ کر مسلمانوں کو سمجھائیں کہ وہ کسی مصلحت کا شکار ہوئے بغیر گائے کی قربانی کریں کیونکہ گائے کی قربانی ممنوع نہیں ہوئی ہے اور خود بھی اپنے ایریا (چاند پٹی رسول پور وغیرہ) میں مسلمانوں کو اس فریضے کی ادائیگی پر آمادہ کیا اور الحمدللہ پولیس کے خوف کے بغیر اس پر عمل کرایا۔

س : ہندوستان کے پرآشوب دور میں مولانا مرحوم نے کس طرح تحریک کی رہنمائی فرمائی ؟

ج : تقسیم ملک کے بعد ہندوستان میں جماعت اسلامی کی نئی تشکیل ہوئی اور مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندوی مرحوم اس کے پہلے امیر منتخب ہوئے مولانا نے پوری جرأت و ہمت کے ساتھ تحریک کی قیادت فرمائی۔ اور ہر طرح کے نرم و گرم حالات میں اپنی ذمہ داری بحسن و خوبی انجام دی۔ مسلمانوں کیلئے

حالات بہت سخت تھے ان کے اندر مایوسی نے راہ پالی تھی۔ بہتوں کے قدم اکھڑ چکے تھے اور پاکستان کی راہ لے رہے تھے مولانا نے اس سلسلے میں مضامین لکھے مسلمانوں کو بہت دھارس دلائی کہ وہ ایک داعی گروہ ہیں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھیں اور ہندوستان میں جم جائیں اور اپنے فریضے (دعوت حق) کو پوری جرأت و ہمت کے ساتھ ادا کریں اللہ ان کا حامی و ناصر ہوگا اور دنیا و آخرت کی کامیابی ان کے قدم چومے گی، مولانا مرحوم کی جرأتمندانہ تحریروں اور تقریروں نے مسلمانوں کے قدم جما دیئے اور وہ اپنے فریضے کی ادائیگی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

س: آپ نے مولانا کو بحیثیت انسان کیسا پایا؟

ج: میں نے مولانا کو علامہ اقبال کے اس شعر کا مصداق پایا۔ ؎

نگہ بلند سخن دلنواز جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کیلئے

س: مولانا مرحوم جماعتی کاموں میں کن چیزوں پر زیادہ توجہ فرمایا کرتے تھے؟

ج: مولانا مرحوم اس پر خاص توجہ دیتے تھے کہ کارکنان تحریک اسلامی اپنے اخلاق و کردار کو اسلام کے سانچے میں ڈھالیں اور اپنے عمل و قول سے اسلام کی سچی شہادت پیش کریں اور اس بات کے لئے کوشاں رہیں کہ اسلام کا پیغام ملک کے ایک ایک فرد تک پہونچ جائے۔

س: مولانا جامعۃ الفلاح کے بنیادی ارکان میں سے تھے مولانا کن صورتوں میں اس کو ترقی کرتے دیکھنا چاہتے؟

ج: مولانا کی یہ کوشش تھی کہ جامعۃ الفلاح کا ہر ہر طالب علم قرآن و حدیث کا نہ صرف وسیع علم حاصل کرے بلکہ ساتھ ہی ساتھ اس کا صحیح نمونہ بنے، اور آئندہ زندگی میں اپنی تحریر و تقریر سے امت مسلمہ کو صحیح رہنمائی دے اور دنیوی مفاد کی طرف توجہ دیئے بغیر فریضہ اقامت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ میں مشغول رہے۔

س: مولانا کے انتقال کی خبر سن کر آپ کو کیسا محسوس ہوا؟

ج: ادھر دو ایک سال سے مولانا کمزور ہوتے جارہے تھے چنانچہ بار امارت سے سبکدوش ہوکر جب وطن (چاند پٹی) تشریف لائے تو صورتحال یہ تھی کہ جب وہ گھر سے مسجد کو نماز کے لئے جاتے تو کمزوری

کی وجہ سے آہستہ آہستہ چلتے جبکہ مولانا ہمیشہ سے بہت تیز رو تھے۔ انھیں حالات میں دل کا دورہ پڑا اور وہاں نرسنگ ہوم (اعظم گڈھ) میں زیر علاج رہے، شروع شروع میں کچھ افاقہ محسوس ہوا لیکن حالت بگڑتی گئی اور انتقال کے ایک روز قبل بالکل مایوس کن کیفیت ہوگئی تھی بالآخر مولانا اللہ کو پیارے ہوگئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وفات کی خبر سن کر سخت صدمہ ہوا لیکن درجہ بدرجہ تبدیلی حالات کے پیش نظر یہ حادثہ خلاف توقع نہیں تھا، نیز مولانا عمر طبعی کو بھی پہونچ چکے تھے۔

س: مولانا کی کس خوبی نے آپ کو زیادہ متاثر کیا؟

ج: سادگی، اخلاص، اور للہیت نے۔

س: مولانا سے آپ کی آخری ملاقات کب ہوئی؟

ج: جب مولانا بار امارت سے سبکدوش ہو کر وطن تشریف لائے۔

س: کیا اس موقع کی مناسبت سے ہمیں کوئی پیغام دینا پسند فرمائیں گے؟

ج: میرا پیغام یہ ہے کہ مولانا نے جس نصب العین کے حصول میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ کھپایا اور جس کے لئے اپنی ساری توانائیاں نچھاور کردیں۔ آپ اس نصب العین کو اپنالیں اسی میں اپنی صلاحیتوں کو لگائیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی سے شاد کام ہوں۔

بقیہ کیا اور کوئی بھائی ہوگا

مجھے ان کی بیماری کی اطلاع نہ ملی لیکن جب مجھے معلوم ہوا تو میں فوراً ہی اسپتال پہونچی میں جس وقت اسپتال میں ان کے کمرہ میں داخل ہوئی تو مجھے دیکھتے ہی فوراً سلام کیا اور خیریت پوچھی اور کہنے لگے تم کو کیسے معلوم ہوگیا کہ میں یہاں ہوں؟ تم نے خواہ مخواہ تکلیف کی۔ میں نے اسپتال ہی میں رات گذارنی چاہی لیکن انھوں نے مجھے جانے پر مجبور کردیا کہنے لگے گھر چلی جاؤ ورنہ یہاں زمین پر سونا پڑے گا ٹھنڈک کا موسم ہے تمھیں تکلیف ہوگی میں انشاء اللہ جلد ہی ٹھیک ہو جاؤں گا چنانچہ میں گھر آگئی اور دوسرے دن یہ خبر آئی ہے کہ تمھارا آخری محسن بھی چل بسا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

عظیم انسان عظیم باتیں

صاحبزادہ عبدالعظیم خاں صاحب
مرکز جماعت اسلامی ہند دہلی

برادرِ عزیز محمد اسمٰعیل صاحب فلاحی ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا خط مورخہ ۲ر جنوری ۹۱ء وطن سے واپسی پر مجھے غالباً ۲۲ر جنوری ۹۱ء کو ملا۔ اس میں یہ تحریر نہ تھا کہ مطلوبہ معلومات کی آپ کو کب تک ضرورت ہے۔ طبیعت ناساز تھی اور اب بھی ہے، اس لئے آپ سے معلومات کرنے کے لئے سوچ ہی رہا تھا کہ آپ کا دوسرا پوسٹ کارڈ مورخہ ۲۵ر جنوری ۹۱ء ۲ر فروری ۹۱ء کو ملا۔ اس میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے کہ کب تک ضرورت ہے۔ لیکن چونکہ آپ نے تقاضا کیا ہے۔ اس لئے فوری طور پر ناسازیٔ طبیعت کے باوجود جو چند باتیں یاد آئیں، تحریر کر رہا ہوں۔

مولانا ابواللیث صاحب مرحوم کی سادگی، رفقاء کے ساتھ نہایت درجہ شفقت بیت المال کے پیسے کے سلسلہ میں حد درجہ احتیاط اور معاملات میں کھرے ہونے نے مجھے کافی متاثر کیا۔ جبل پور ریلیف کا کام جب ۱۹۶۲ء میں ختم ہوا تو اگست ۶۲ء میں مجھے مرکز بلایا گیا۔ اس وقت مرکز ۱۵۲۵ سوئی والان میں تھا۔ نیچے دعوت اخبار کا دفتر تھا اور اوپر مرکزی دفتر، مہمان خانہ، مطبخ اور کارکنان دعوت و مرکز کی رہائش یہ سب اوپر کی منزل میں تھے۔ میں جب مرکز پہنچا تو مولانا مرحوم تنہا رہتے تھے۔ اپنے اہل و عیال کو مرکز نہیں لائے تھے۔ جس میں سب رفقاء کے ساتھ کھانے ناشتہ میں شریک رہتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ مولانا سب کا خیال رکھتے ہیں۔ خصوصاً مہمانوں کا۔ مجھے مرکز آئے دو چار روز ہی ہوئے تھے کہ ایک دن شب میں دیر سے ایک مہمان تشریف لائے۔ یہ صاحب عرفان احمد خاں تھے میں ان سے واقف نہ تھا، بعد میں ان کی خصوصیات سے واقفیت ہوئی۔ رات کو تو وہ دفتر دعوت میں سو گئے۔ صبح نماز میں غالباً مولانا سے ملاقات ہوئی، نماز کے بعد وہ پھر سو گئے۔ ناشتہ کے وقت جب سب رفقاء جمع ہوئے تو مولانا نے فرمایا کہ جو مہمان رات کو آئے ہیں وہ کہاں ہیں؟ پھر مجھ سے فرمایا کہ جاؤ نیچے کہیں سو رہے ہوں گے، انکو بلا لاؤ۔ جب وہ تشریف لائے تو پھر سب کے ساتھ ناشتہ کیا۔ اسی طرح کھانے وغیرہ پر سب کا خیال رکھتے۔ کوئی رفیق موجود نہ ہوتا تو معلومات فرماتے۔

مہمانوں کا مولانا خصوصی طور پر خیال رکھتے تھے۔ جب تک میں ناظم مہمان خانہ رہا میں نے دیکھا

کہ مولانا ہمیشہ مہمانوں کے بارے میں، اُن کے آرام و رہائش، کھانا ناشتہ وغیرہ کے سلسلہ میں دریافت کیا کرتے تھے۔ مہمانوں کے علاوہ کوئی بھی غیر متعلق آدمی آتا تو اس کے بارے میں بھی معلوم فرماتے اور خصوصی نگاہ رکھتے کہ کوئی غیر متعلق شخص مرکز میں قیام پذیر نہ ہو۔

اسی ضمن میں مسلم صاحب مرحوم ایڈیٹر دعوت کی بتائی ہوئی بات یاد آئی۔ مسلم صاحب مرحوم نے ایک بار دوران گفتگو مجھ سے فرمایا کہ میں جب جماعت اسلامی کے پیغام سے متاثر ہوا تو مرکز گیا۔

اس وقت مرکز غالباً ملیح آباد میں تھا۔ وہاں لوگوں سے ملاقات اور بات چیت ہوئی ایک دو یوم قیام کے بعد ایک دن صبح اپنے وطن کے لئے روانہ ہو گیا۔ مولانا ابواللیث صاحب کو جب معلوم ہوا کہ بغیر ناشتہ کئے ہی میں روانہ ہو گیا تو انھوں نے کسی کو میرے پیچھے دوڑایا جب میں واپس آیا تو فرمایا کہ بغیر ملے اور بغیر ناشتہ کئے آپ کیسے جا رہے ہیں۔ اپنے گھر سے وہ ناشتہ لائے۔ بہت ہی سادہ۔ مسلم صاحب مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ اس سادگی نے مجھے کافی متاثر کیا اور میں نے اسی وقت جماعت کا رکن بننے کا ارادہ کر لیا۔

مولانا حبیب اللہ صاحب مرحوم راجستھان کے امیر حلقہ تھے۔ ان کے آخری دور میں ارکان راجستھان کا جے پور میں اجتماع ہوا۔ مولانا ابواللیث صاحب نے بھی شرکت فرمائی۔ اجتماع ختم ہونے کے بعد یوسف صاحب صدیقی مرحوم کی تعزیت کے لئے ٹونک جانے کا اظہار فرمایا۔ چنانچہ میں اُن کے ہمراہ ٹونک گیا۔ جے پور سے عشاء کے قریب روانگی ہوئی۔ راستہ میں مولانا نے فرمایا حبیب الدین خاں ایڈوکیٹ کے یہاں قیام کریں گے۔ اور صبح تعزیت و فاتحہ کے بعد جلد واپسی ہونا ہے۔ رات $\frac{1}{2}$ ۱۰، گیارہ بجے کے قریب ہم ٹونک پہنچے چونکہ میرے اہل و عیال دہلی میں تھے۔ میرا مکان مقفل تھا۔ اس لئے مولانا کو اپنے بھائی کے گھر لے گیا۔ ہم دونوں بھائی ایک ہی حویلی میں رہتے ہیں رات زیادہ ہو گئی تھی سب گھر والے کھانے وغیرہ سے فارغ ہو گئے تھے۔ اس لئے ہمارے پہنچتے ہی آدھ گھنٹے کے اندر کھانے کا نظم کر دیا گیا۔ اس وقت میٹھی چیز کا انتظام نہ ہو سکا تو میں نے بازار سے وہاں کی معروف مٹھائی منگوائی کھانے کے بعد جب مٹھائی سامنے آئی تو ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ کہا کہ آپ نے تکلیف کیا اگر یہ نہ منگاتے تو زیادہ خوشی ہوتی۔ پھر رات ہی کو ہم حبیب الدین خاں صاحب ایڈوکیٹ کے یہاں گئے۔ وہیں رات کو قیام کیا، صبح صدیقی صاحب مرحوم کے مکان پہ بھائی کے لڑکوں سے تعزیت کی اور قبرستان جا کر فاتحہ پڑھی پھر وہیں سے بالا بالا بس اسٹینڈ پہنچے اور جے پور واپسی ہوئی۔

مولانا بیت المال کے معاملہ میں بہت محتاط تھے کبھی کوئی رقم میرے علم کی حد تک بے جا صرف نہیں کی اپنی ذات کے معاملہ میں تو بہت ہی احتیاط کرتے تھے جائز ضرورت پر بھی صرف نہ کرتے گرمیوں میں کمرہ میں روم کولر استعمال کرنے کے بجائے باہر دھوپ میں بیٹھ کر کام کرتے گرمیوں میں کولر لگانے کے بجائے کمرہ بند کر کے پنکھے ہی سے کام لیتے۔ اپنے آرام یا سہولت کے لئے گھر میں کسی ترمیم وغیرہ کی ضرورت ہوتی تو ظاہر نہ فرماتے، تکالیف برداشت کرتے رہتے۔

مولانا فرمایا کرتے تھے کہ اپنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلانا چاہئے۔ اِدھر اُدھر کی غلط توقعات پر مصارف کرنا درست نہیں۔ کوئی صاحب اپنی مسجد یا مدرسہ کے لئے سفارش کرانے آتے تو ان کو ہمیشہ discourage کرتے فرماتے کہ اپنے بل بوتے پر کام کریں، اللہ مدد فرمائے گا۔

اس لئے کبھی انھوں نے کسی کی درخواست پر خود سفارش نہیں کی، اس کام کے لئے جماعت کے ایک سیکریٹری کو مقرر کر رکھا تھا کہ وہ بعد تحقیق جو مناسب سمجھیں کارروائی کریں۔ مولانا اگر چاہتے تو اپنے لڑکے کو عرب ممالک میں کہیں بھی بھیج سکتے تھے لیکن انھوں نے ہمیشہ احتراز کیا۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ کبھی سوچا بھی نہیں تو غالباً یہ درست ہو گا۔

مولانا اپنا ذاتی حساب نوٹ کیا کرتے تھے۔ اور بیت المال سے متعلق خصوصی چیزیں نوٹ کیا کرتے۔ بعد میں اُسے چیک بھی کرتے اور حساب کا میلان بھی ان کے ذاتی حساب میں اگر ہم کچھ خرچ کرتے اور ان سے طلب نہ کرتے تو خود متوجہ فرماتے اور صرف شدہ رقم ادا کرتے ایک بار میں نے اپنے قوم کے بستر بند پر کپڑا چڑھوا دیا۔ مولانا نے دیکھا تو پسند کیا۔ فرمایا کہ میرا بستر بند بھی خراب ہو گیا ہے کیا پھر بھی ایسا ہی کپڑا چڑھوا دیں۔ چنانچہ جب میں وطن جانے لگا تو بستر بند لے گیا اور کپڑا چڑھوا کر لایا۔ پسند فرمایا۔ اور مصارف معلوم کئے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ نے ہمارے وطن میں یہ ایک بڑا کام اپنا کرایا ہے۔ معمولی مصارف ہوئے ہیں۔ دینے کی ضرورت نہیں۔ فرمایا کہ چونکہ میری خواہش پر یہ کام ہوا ہے اس لئے جو مصارف ہوئے ہیں وہ تو دینا ہی ہیں۔ پھر اصرار کر کے مصارف ادا کئے۔

مولانا مرحوم اپنی امارت کے آخری دنوں میں بوجہ بیماری جماعتی کاموں پر کما حقہ وقت نہیں دے پاتے تھے۔ اسی وجہ سے جب نئے انتخاب کا وقت آیا تو انھوں نے اپنی معذوری اور مجبوری بیان کر کے اپنا نام نہ پیش کرنے کی پرزور درخواست کی۔ نئے انتخاب میں جناب سراج الحسن صاحب

امیر منتخب ہوئے۔ انکی اور ہم لوگوں کی بھی خواہش تھی کہ مولانا دہلی ہی میں رہ کر جماعتی یا دیگر کام کریں۔ چنانچہ محترم سراج الحسن صاحب نے مولانا سے فرمایا کہ وہ تو اپنی فیملی دہلی لا نہ سکیں گے جس مکان میں اس وقت مولانا رہ رہے ہیں اسی میں قیام پذیر رہیں۔ اور کچھ پیش کش کی کہ یہ یا اس قسم کا کام کیا جاسکتا ہے مولانا مرحوم کرنے کے مکان میں رہائش رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کوئی علیحدہ مکان کہیں مل جائے۔ میں نے بھی اس سلسلے میں کوشش کی۔ چنانچہ ایک رفیق نے ابوالفضل اینکلیو کالونی میں اپنا مکان پیش کر کے مجھ سے کہا کہ اس میں حسب ضرورت مزید تعمیر کرالی جائے کچھ ماہ بعد وہ تمام مصارف ادا کر دیں گے اسی قسم کی پیش کش ایک اور رفیق نے بھی کی۔ ان دونوں مکانات میں صرف ایک ایک کمرہ غسلخانہ اور بیت الخلاء بنا ہوا تھا۔ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ فی الحال تو وہ مرکز میں اسی مکان میں قیام پذیر رہیں جس میں رہ رہے ہیں۔ سات آٹھ ماہ کے اندر ان شاء اللہ ان دونوں مکانات میں سے ایک میں ان کی ضرورت کے مطابق کمروں وغیرہ کی تعمیر مکمل ہو جائے گی مگر مولانا نے فرمایا کہ میں یہ غلط مثال قائم نہ کروں گا۔ اس وقت اگر مناسب مکان مل جاتا تو سوچا جا سکتا تھا۔ پھر مجھے تو سفر حج پر جانا پڑا۔ اور مولانا میری واپسی سے پہلے ہی اپنے وطن تشریف لے گئے۔

جب میں ۱۲ جولائی ۱۹۹۰ء کو واپس دہلی آیا تو مجھے مولانا کا پرچہ ۲۸ جولائی ۹۰ء کا تحریر کیا ہوا ملا۔ میں نے ۱۰ اگست کو اور پھر ۱۱ اکتوبر ۱۹۹۰ء کو مولانا کو خط لکھ کر تحریر کیا کہ "ایک عریضہ آپ کی خدمت میں پیش کیا تھا جس کی وصول کی اطلاع اور بہت ہی مختصر ارشاد عزیزی عبداللہ صاحب کے ذریعہ مل سکا۔ تسلی نہیں ہوئی، دل چاہتا ہے کہ آپ کے دست مبارک سے حالات اور آئندہ کے پروگرام کے بارے میں معلوم ہو جائے تو بہتر ہے .... اگر آپ اپنے پروگرام سے مطلع فرمائیں اور ہماری درخواستوں پر توجہ فرما کر دہلی قیام کرنے کا فیصلہ فرمائیں تو ناظر صاحب سے مکان کے سلسلے میں مزید بات چیت کی جائے۔"

۱۰ اکتوبر ۹۰ء کو جواب میں مولانا نے تحریر فرمایا: "مجھے آپ کی یہ خواہش جس کا بار بار آپ اظہار کرتے رہے ہیں اچھی طرح یاد ہے کہ آپ مجھے دہلی ہی میں مقیم دیکھنا چاہتے تھے۔ آئندہ کا حال تو اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے اور میں نے اپنا معاملہ بالکلیہ اسی کے حوالہ کر رکھا ہے لیکن جہاں تک خود میری اپنی خواہش کا تعلق ہے وہ تو یہی ہے کہ زندگی کے جو ایام بھی باقی رہ گئے ہیں، وہ یہیں اپنے وطن

مالوف میں بسر ہوں، اور میرا جسد خاکی جہاں کی خاک سے مرکب ہوا تو وہیں پیوند خاک ہو۔ والامر بیداللہ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ایمان پر خاتمہ نصیب فرمائے اور اپنے دامن عفو میں جگہ دے۔"

کسے معلوم تھا کہ یہ خواہش اتنا جلد پوری ہونے والی ہے۔ میں نے اسی خط کا جواب ۲۸ر نومبر ۸۹ء کو لکھا لیکن وہ رجسٹری واپس آگئی، اور وہ ۵ر دسمبر ۸۹ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مولانا مرحوم کیسے باہمت، کیسے اولوالعزم، غیر متزلزل ارادہ کے مالک، باحوصلہ سیاسی حالات پر گہری نظر رکھنے والے، صائب الرائے، معاملہ فہم، جماعت کو بہت ہی نازک وقت اور مخالف حالات میں اپنے صحیح نصب العین کے ساتھ اس طرح آگے بڑھانے والے کہ اس کا وزن محسوس کیا جائے۔ چومکھی لڑائی لڑنے والے اور ہر محاذ پر اپنا راستہ نکالنے والے — غرض کیا بتایا جائے کہ وہ کن کن خوبیوں کے مالک تھے۔ اب وہ ہم میں نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صبر عطا فرمائے اور ان کا نعم البدل عطا فرمائے آمین۔

آپ نے اپنے خط میں جو عنوانات دیئے ہیں، ان کے لئے وقت چاہیے۔ اور پچھلا ریکارڈ کھنگالنے کی ضرورت ہے اس لئے اس وقت جو باتیں یاد آئیں وہ تحریر کر دی گئیں ہیں۔

فقط والسلام

خط لکھنے کے بعد ایک دو باتیں اور یاد آئیں ان کو علیحدہ لکھ رہا ہوں، مناسب خیال فرمائیں تو شامل کر دیں، ورنہ رہنے دیں۔

دعوت اخبار پر حکومت کافی مہربان رہی ہے۔ متعدد مقدمات چلائے۔ محمد صغیر صاحب دعوت کے نائب مدیر تھے۔ اس میں شائع شدہ ایک خبر یا مضمون پر سرکار نے مقدمہ قائم کر کے صغیر صاحب کو گرفتار کر لیا، اور ریمانڈ لے کر تہاڑ جیل بھیج دیا۔ رفقاء ان سے ملاقات کرنے گئے۔ عشاء بعد آکر مولانا مرحوم کو اطلاع دی کہ جیل والوں نے ان کے ساتھ زیادتی کی ہے، اور ان سے گھاس چھلوائی ہے مولانا بے چین ہو گئے۔ اور اسی وقت مجھے ساتھ لے کر ہوم منسٹر کے پاس گئے۔ غالباً لال بہادر شاستری ہوم منسٹر تھے۔ لیکن وہ اس وقت موجود نہ تھے کسی میٹنگ میں گئے ہوئے تھے۔ دوسرے دن صغیر صاحب کی

ضمانت ہو گئی۔ مولانا نے ممکن ہے شکایتی خط لکھا ہو۔ لیکن مجھے اس کا علم نہیں۔

مولانا کی بچی جامعۃ الصالحات میں پڑھتی تھی۔ کسی وجہ سے ایک دو ماہ کی فیس مولانا نہ بھیج سکے مہتمم صاحب یا کسی رفیق کو معلوم ہوا تو اس خیال سے کہ مولانا کے پاس تقاضے کا خط نہ جائے فیس جمع کرادی۔ جب وسعت ہوئی اور مولانا نے فیس بھیجی تو معلوم ہوا کہ فیس جمع ہو چکی ہے۔ مولانا نے دریافت کیا کہ انھوں نے فیس جمع کی نہیں تھی۔ وہاں کسی نے جمع کی۔ معلوم ہونے پر ان کو روپے ادا کئے۔

۹-۵-۹۱

۲۸ر جولائی ۸۹ء

بخدمت جناب الحاج صاحبزادہ عبدالعظیم خاں صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ،

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

فریضہ حج کی ادائیگی کے بعد بخیر و عافیت مراجعت فرما ہونے پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اللہ تعالیٰ حج مبرور کا ثواب عطا فرمائے۔ امید کرتا ہوں کہ آپ نے میری خواہش و تمنا کو جس کا اظہار آپ کی روانگی کے وقت کیا تھا ضرور پیش نظر رکھا ہوگا اور میرے حق میں ایمان کی سلامتی اور خاتمہ بالخیر اور مغفرت کے لئے ضرور دعائیں کی ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور اس دعا کے لئے مکرر درخواست ہے۔

مجھے نہایت افسوس ہے کہ آپ کی واپسی پر میں آپ کی ملاقات سے محروم رہونگا کیونکہ میرا گھر جانے کا پروگرام پہلے متعین ہو چکا ہے۔ میں انشاء اللہ ۲۸ر جولائی کو شب میں یہاں سے روانہ ہونگا۔ اور آپ ۳۱ر کو آنے والے ہیں۔ خدا کرے آپ سے ملاقات کی کوئی سبیل نکل آئے اس کی بڑی تمنا ہے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔ والسلام

دعاگو اور دعا خواہ

ابو اللیث۔

بخدمت گرامی جناب صاحبزادہ عبد الحفیظ فرزان صاحب

١٠ اکتوبر ١٩٩٠ء   مرکز جماعت اسلامی ہند دہلی

چاند پٹی ضلع اعظم گڈھ

برادر عزیز و مکرم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہٗ

مجھے نہایت افسوس ہے کہ باوجود دل کے شدید تقاضے کے مختلف موانع کی بنا پر اس سے پہلے آپ کو کوئی خط نہیں لکھ سکا، دراں حالیکہ آپ نے ازرہِ محبت اپنے مبارک سفر سے واپس آکر فوراً ہی مجھے یاد بھی فرمایا۔ اور ساتھ ہی اپنے قیمتی تحفوں سے بھی نوازا تھا۔ اس تاخیر میں زیادہ دخل شاید اس بات کا ہے کہ دہلی سے روانہ ہوتے وقت میں نے ایک خط آپ کے نام تحریر کر دیا تھا جو آپ کو سفر سے واپسی پر غالباً ملا ہوگا۔ اس سے آپ کو میرے اس وقت کے جذبات و احساسات کا پورا حال معلوم ہوا ہوگا۔ میں نے بس اُسی کو کافی سمجھا تھا۔ اس کے بعد یہاں پہنچنے پر آپ کی خیر و عافیت مختلف ذرائع سے برابر معلوم ہوتی رہی جس سے طبیعت کو اطمینان حاصل رہا، اور یہ معلوم کر کے خاص طور سے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ کا قیام مرکز ہی میں ہے اور آپ حسب سابق اپنے سابقہ مفوضہ فرائض انجام دے رہے ہیں لیکن جی چاہتا ہے کہ خود آپ کے قلم سے آپ کی خیر و عافیت اور آپ کی موجودہ مصروفیتوں وغیرہ کا حال معلوم ہو تاکہ مزید اطمینان نصیب ہو سکے۔ امید ہے آپ ضرور اس سے ممنون فرمائیں گے۔

مجھے آپ کی یہ خواہش جسکا بار بار آپ اظہار کرتے رہے ہیں، اچھی طرح یاد ہے کہ آپ مجھے دہلی ہی میں مقیم دیکھنا چاہتے تھے آئندہ کا حال تو اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے اور میں نے اپنا معاملہ بالکل اس کے حوالے کر رکھا ہے لیکن جہاں تک خود میری اپنی خواہش کا تعلق ہے وہ تو یہی ہے کہ زندگی کے جو ایام بھی باقی رہ گئے ہیں وہ یہیں اپنے وطن مالوف میں بسر ہوں اور میرا جسد خاکی جہاں کی خاک سے مرکب ہوا ہے وہ وہیں پیوندِ خاک ہو۔ والامر کلہ بید اللہ

دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ایمان پر خاتمہ نصیب فرمائے اور اپنے دامنِ عفو میں جگہ دے۔

اہلِ مرکز اور تمام پرسانِ حال کی خدمت میں سلام عرض ہے اپنے اہل و عیال کو بھی سلام دعا پہنچا دیں۔

والسلام ابو اللیث

محمد عنایت اللہ سبحانی

مولانا کا نام نامی

مولانا مرحوم کا خاندانی نام شبیر محمد تھا۔ بعد میں بدل کر ابو اللیث ہو گیا۔ اور اسی نام سے مولانا معروف ہوئے۔

مولانا مرحوم کا یہ نام کب تبدیل ہوا؟ اور کس نے مولانا کے لئے یہ نام تجویز کیا؟ اس کا انکشاف کرتے ہوئے مولانا نے راقم الحروف سے ایک بار فرمایا۔

مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ العالی جو میرے مشفق استاذ تھے، انہوں نے ایک موقع پر مجھ سے فرمایا۔

ہ آپ اپنا نام تبدیل کر لیں تو اچھا ہے؟

میں نے کہا، آپ میرے لئے کیا نام تجویز فرماتے ہیں؟

مولانا اصلاحی ؛ میرا خیال ہے آپ اپنا نام ابو اللیث رکھ لیں تو بہتر رہے گا۔

اس تجویز کے جواب میں مولانا مرحوم ہنس پڑے، جس کا مطلب یہ تھا کہ مولانا مرحوم نے مولانا اصلاحی کی تجویز سے اتفاق نہیں کیا۔

چنانچہ اس کے بعد بھی مولانا اپنا نام شبیر محمد ہی لکھتے رہے۔

پھر اسکے بعد ایک بار ایسا ہوا کہ مولانا علامہ سید سلیمان ندویؒ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے (ضمناً اس بات کا تذکرہ مناسب ہوگا کہ مولانا مرحوم سید صاحب کے یہاں برابر جایا کرتے تھے۔ سید صاحب مولانا مرحوم کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ اور مولانا بھی سید صاحب سے کچھ بے تکلف سے تھے۔)

چنانچہ سید صاحب نے بھی اپنی ایک مجلس میں مولانا مرحوم کو مشورہ دیا کہ آپ اپنا نام کچھ اور رکھ لیں تو اچھا ہے۔

مولانا مرحوم ؛ تو آپ ہی میرے لئے کوئی دوسرا نام تجویز فرما دیں۔

علامہ ندویؒ ؛ ٹھیک ہے، میں کوئی بہتر نام سوچ کر بتاؤں گا۔

مولانا مرحوم :۔ مولانا امین احسن صاحب بھی اس سے پہلے مجھ کو نام کی تبدیلی کا مشورہ دے چکے ہیں۔

علامہ ندوی : تو کیا انہوں نے کوئی دوسرا نام بھی بتایا ہے؟

مولانا مرحوم : جی ہاں! ان کا خیال تھا کہ میں شبیر محمد کے بجائے ابواللیث اپنا نام بتاؤں۔

علامہ ندوی : یہ نام تو بہت عمدہ ہے۔ اب اس کے بعد کوئی دوسرا نام سوچنے کی کیا ضرورت ہے

چنانچہ اسی وقت یہ طے ہو گیا کہ اب سے مولانا کا نام شبیر محمد کے بجائے ابواللیث ہوگا۔

وہاں سے لوٹ کر مولانا جب مدرسۃ الاصلاح تشریف لائے تو مولانا امین احسن اصلاحی صاحب سے علامہ ندوی سے ملاقات کی پوری روداد بیان کی۔ اور یہ بتایا کہ اب میرا نام ابواللیث ہے

اس پر مولانا اصلاحی بے ساختہ ہنس پڑے۔ اور لطف لیتے ہوئے فرمایا، چھوٹوں کی باتیں لوگوں کو نہیں پسند آتی ہیں۔ لیکن جب وہی باتیں بڑوں کے منہ سے گزر کر آتی ہیں تو بھلی لگنے لگتی ہیں۔

(بقیہ باپ کا پیار بھی دیا ماں کی ممتا بھی)

سوال :۔ مولانا تعطیل کے ایام جب گھر پر گذارتے تھے تو ان کے مشاغل کیا ہوتے تھے؟

جواب :۔ تعطیل کے ایام میں بھی ابا جان اپنے اصولوں کے بہت پابند رہتے تھے۔ ہر ناشتہ کے بعد وہ لکھنے پڑھنے میں مشغول ہو جاتے تھے۔ اور ہم لوگوں کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ابا جان اب اپنے دفتر میں چلے گئے ہیں۔ اور پھر ½۱۲ بجے وہ [illegible] کو طعام فرمانے کے لئے اٹھتے تھے۔ اور پھر نماز ظہر کی ادائگی کے بعد تھوڑی دیر آرام فرماتے تھے۔ اس کے علاوہ کھیتی وغیرہ سے متعلق بھی کام کرتے تھے۔

سوال :۔ کیا مولانا نے آپ لوگوں کو کوئی وصیت فرمائی ہے؟

جواب :۔ وقتِ وفات ہم تین بہنیں ابا جان کے پاس تھیں۔ ۵/۶ دسمبر ۱۹۹۰ء کی صبح کو ابا جان اسی اطمینان و سکون سے اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے گویا ان کو دنیا سے کوئی سروکار اور واسطہ ہی نہ ہو۔ اور انہوں نے ہم لوگوں کو کوئی وصیت نہیں فرمائی تھی۔

صالحہ تبسم ۲۶/۱۲

گلشن کی روح جانِ بہاراں چلا گیا

عمران اعظمی

گل برگ گل عذار و گل افشاں چلا گیا
گلشن کی روح جانِ بہاراں چلا گیا

چھیڑے تھے جس نے گیت اخوت کے چار سو
وہ نغمہ سنج بلبلِ شاداں چلا گیا

لطف و کرم سے جس کے تھے سرشار خاص و عام
ہمدرد و غم گسار و مہرباں چلا گیا

وہ پاسبانِ علم و یقیں آبروئے قوم
وہ کاروانِ دیں کا نگہباں چلا گیا

تھی ذات جس کی دینِ شریعت کی ترجماں
وہ حق شناس مردِ مسلماں چلا گیا

تا عمر جس کے دل میں تھا انسانیت کا درد
وہ پیکرِ خلوص وہ انساں چلا گیا

اب بھی نگاہِ شوق جسے ڈھونڈتی پھرے
کیوں بزمِ شوق ناز سے مہماں چلا گیا

انٹرویو

مولانا مرحوم کی چھوٹی بہن ختم النساء صاحبہ

ملاقاتی : جاوید سلطان اعظمی متعلم عربی ششم

سکریٹری جمعیۃ الطلبہ جامعۃ الفلاح

کیا اور کوئی بھائی ہوگا جو اپنی بہن کو اتنا عزیز رکھتا ہو

س : آپ کے کتنے بہن بھائی ہیں ؟

ج : ہماری پانچ بہنیں اور پانچ بھائی تھے۔ لیکن اس وقت میرے علاوہ سب کا انتقال ہو چکا ہے اور میں اپنے بھائیوں اور بہنوں میں سب سے چھوٹی ہوں۔

س : آپ کے والد صاحب مرحوم کا اسم گرامی کیا تھا ؟

ج : شیخ توجہ حسین

س : مولانا آپ سے کتنے بڑے تھے ؟

ج : تقریباً سات آٹھ سال

س : مولانا کا معاملہ آپ کے ساتھ کیسا رہتا تھا ؟ کیا شفقت کا رویہ رکھتے تھے ؟

ج : میرے ساتھ بھیا کا سلوک بہت اچھا تھا۔ میں تو یہی سوچتی تھی کہ کیا ان کے علاوہ بھی کوئی ایسا بھائی ہوگا۔ جو اپنی بہن کو اتنا عزیز رکھتا ہو۔ بھیا کی شفقت و محبت کی چند ایک مثالیں اس طرح ہیں۔ جب بھیا حج کو جا رہے تھے تو میں چاند پٹی ہی میں تھی مجھ کو ایک کنارے لیجا کر کہنے لگے دیکھو! یہ کھیت وغیرہ ہیں ان میں تمہارا بھی حق ہوتا ہے میں سوچتا ہوں کہ حج کو جانے سے قبل تمہارا جو کچھ ہے وہ تمہارے حوالہ کر دوں زندگی کا کیا بھروسہ اور کیا ہی بہتر ہوتا کہ میری واپسی نہ ہو تو اس لیے تم اپنا حصہ لے لو اور ان کے بار بار اصرار پر جب میں کچھ لینے پر راضی ہوئی تو انھوں نے مجھ سے یہ قول لیا کہ بعد خدا کے یہاں میرے خلاف کچھ نہ کہنا میری ایک بھتیجی (مولانا مرحوم کی لڑکی) ہماری گفتگو کو سن رہی تھی اس نے برجستہ کہا والد صاحب آپ تو اپنی بہن کا اتنا خیال رکھتے ہیں اور آپ لوگوں کے درمیان اتنا قول و قرار ہو رہا ہے بھیا نے جواب دیا یہ میری بہن ہے میرے اوپر اس کے حقوق

ہیں تم لوگوں کا حق تو بعد میں ہوتا ہے۔

میرے ایک لڑکے کی شادی تھی بھیا اس وقت بریلی جیل میں تھے انھیں معلوم ہوا تو انھوں نے اظہار افسوس کیا اور بھابھی کے پاس لکھا کہ شادی میں تم چلی جانا ورنہ اس کو تکلیف ہوگی چنانچہ بھابی میرے گھر تشریف لائیں۔

میں چھوٹی تھی لیکن بھیا ہمیشہ سلام میں پہل کرتے تھے اور گھر میں داخل ہوتے ہی پہلا سوال یہی کرتے کہ تم نے کھانا کھایا کہ نہیں اگر جواب منفی ہوتا تو پہلے اپنے سامنے مجھ کو کھلا لیتے تھے اس کے بعد خود کھاتے تھے۔

جب بھیا آخری بار دہلی سے آئے تو اتفاق سے میں چاند پٹی ہی میں اپنے ایک بھتیجے کے گھر تھی آنے کے بعد جوں ہی انھیں معلوم ہوا کہ میں یہیں پر ہوں فوراً ہی بھتیجے کے گھر چلتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کو میرے یہاں جانے دو اور مجھے وہاں سے اپنے گھر لے آئے لیکن اتفاق کہ سات ہی دن کے بعد مجھے ان کو چھوڑ کر اپنے گھر (گورو بہہ اعظم گڑھ) آنا پڑا کیونکہ میرا ایک لڑکا سعودیہ سے گھر آیا تھا۔ بھیا نے اس وقت مجھ سے یہ کہا کہ اب تو میں مستقل گھر پر ہی رہونگا جب تمہارا لڑکا چلا جائے تو پھر چلی آنا لیکن افسوس لڑکے کے جانے کے بعد ہی بھیا اللہ کو پیارے ہو گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

س : کیا مولانا سے کبھی آپ کچھ طلب فرمایا کرتی تھیں ؟ آپ کی طلب پر مولانا کا کیا رویہ ہوتا تھا

ج : ہاں پہلے جب میرے بچے چھوٹے تھے تو بعض مواقع ایسے آئے کہ مجھے ان کے سامنے اپنی ضروریات رکھنی پڑیں اپنی ضرورت رکھتے دیر نہیں ہوتی تھی کہ مولانا اس کو پوری کر دیتے تھے اگرچہ بھیا شروع ہی سے تنگ حال رہے لیکن اپنے وسعت کی حد تک میری مدد کرتے رہے بعد میں جب کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو مال و دولت سے نوازا میرے منع کرتے اور بے نیازی ظاہر کرنے کے باوجود مجھ کو بحیثیت اپنی چھوٹی بہن کے کچھ نہ کچھ ضرور عنایت کرتے رہتے تھے ابھی دو سال قبل میرے شوہر کا انتقال ہوا تو بھیا میرے گھر آئے اور مجھ کو سو روپیہ دینے لگے میں نے لاکھ منع کیا بالآخر میں لینے پر مجبور ہو گئی اور کہا کہ یہ نہ سمجھنا اب میرا کوئی نہیں ہے میں ہر وقت تمہاری ہر ضرورت پوری کرنے کو تیار ہوں۔ بھیا کے انتقال سے دو مہینہ پہلے میں چاند پٹی گئی تھی۔ وہاں سے رخصت ہوتے وقت یہ

کہہ کر مجھے پچیس روپیہ لینے پر مجبور کر دیا کہ اچھا اپنے پوتوں کے لئے مٹھائی لے لینا بھیا کی تنگ حالت کو میں اچھی طرح جانتی تھی بھیا اپنی قلیل آمدنی پر کیسے اپنے بال بچوں کو لے کر رہتے تھے اس کو دیکھتے ہوئے اگر وہ مجھے ایک روپیہ بھی دیتے تھے تو میں یہی سمجھتی کہ وہ سّو روپیہ دے رہے ہیں، آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں...)

س : کیا مولانا سے آپ کو کبھی کوئی شکایت ہوئی ؟

ج : نہیں، ان کا برتاؤ اتنا پیارا تھا کہ شکایت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

س : کیا مولانا کو کبھی آپ سے کوئی شکایت ؟

ج : میرے علم اور احساس کی حد تک ان کو کبھی مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوئی ہمیشہ ہی وہ مجھ سے خوش رہتے تھے اور خندہ پیشانی سے ملتے تھے ۔

س : کیا مولانا نے آپ کی تعلیم کی طرف توجہ فرمائی ؟

ج : چونکہ اس وقت تعلیم کا کوئی باقاعدہ نظم نہیں تھا اس لئے اس سلسلے میں میرے لئے انھوں نے قابل ذکر حد تک کوئی کوشش نہیں کی ہاں قرآن شریف کا ناظرہ میں نے انھیں سے پڑھا اور اردو پڑھنے میں بھی انھیں کا تعاون رہا۔

س : مولانا آپکو کن کاموں کی نصیحت کرتے تھے ؟

ج : خصوصاً نماز و تلاوت کی، انھیں کی نصیحتوں کا ثمرہ ہے کہ نوافل وغیرہ کے اہتمام کیساتھ ساتھ قرآن کے سات آٹھ پارے روزانہ پڑھ لیتی ہوں ۔

س : مولانا کا اپنے بال بچوں کے ساتھ کیسا سلوک رہتا تھا ؟

ج : بھیا جتنا مجھ کو مانتے تھے اتنا ہی اپنے بچوں کو بھی مانتے تھے اپنی وسعت کی حد تک انکی تمام ضروریات پوری کرنیکی کوشش کرتے تھے اور غصہ وغیرہ جیسی چیز تو مولانا کے اندر نام کی بھی نہیں تھی۔

س : مولانا سے آپ کی آخری ملاقات کب اور کہاں ہوئی ؟ نیز آخری گفتگو کیا ہوئی ۔

ج : تفصیلی آخری ملاقات انتقال سے دو مہینہ پہلے چاندپٹی میں ہوئی تھی سب سے آخری ملاقات اسپتال میں انتقال سے ایک دن قبل ہوئی بھیا نے تو اپنی حد تک یہی کوشش کی تھی کہ

بقیہ صفحہ ۹۳ پر

مولانا کی نمایاں خصوصیات

مولانا نظام الدین اصلاحی صدر جامعۃ الفلاح

نمایاں خصوصیت اس کو کہتے ہیں جو واضح طور پر سامنے آجائے۔ ویسے تو ایک انسان کے اندر خصوصیات بہت ہو سکتی ہیں اور کچھ خامیاں بھی ہو سکتی ہیں مگر بعض چیزیں اتنی نمایاں ہوتی ہیں کہ وہ دیکھنے والوں کے لئے سورج کی طرح روشن ہوتی ہیں اس اعتبار سے میں نے دو نمایاں خصوصیات مولانا کے اندر دیکھی ہیں :-

ا- مولانا جماعتی تعصب سے کوسوں دور تھے ۔ مجھے مولانا کے ساتھ طالب علمی سے لیکر سنہ ۱۹۹۰ء تک مختلف جہت سے رہنے کا موقع ملا ہے ۔ اس طویل مدت میں میں نے مولانا کو بحیثیت استاد بھی دیکھا اور میں طالب علم تھا (یعنی ۱۹۴۲ء کو) اور بحیثیت امیر جماعت بھی دیکھا اور میں امیر حلقہ اور رکن شوریٰ تھا۔ پھر میں نے مولانا کو سنہ ۷۲ء سے سنہ ۸۱ء تک چاندپٹی میں دیکھا جب وہ کسی بھی جماعتی منصب پر فائز نہیں تھے۔ اس پورے عرصہ کے اندر میں نے ہمیشہ اس خصوصیت کو نمایاں پایا انھوں نے اپنے کو صرف جماعت اسلامی کا ہی فرد نہیں سمجھا بلکہ اپنے کو پوری ملت کا فرد سمجھتے ہوئے تعصب اور تحزب سے بالاتر ہو کر کام کیا، عام طور پہ دیکھا جاتا ہے کہ جماعتوں کے ممبران، اس کے ذمہ داران اور اصحاب منصب اپنی اپنی جماعتوں کی خوبیاں موقع بے موقع محتاط و غیر محتاط، اور صحیح اور مبالغہ آمیز طور سے بیان کرتے رہتے ہیں اور دیگر جماعتوں کو نیچی نظر سے دیکھتے اور ان کی جائز خدمات کو بھی تسلیم کرنے کا حوصلہ اپنے اندر نہیں پاتے ۔ ان کے ساتھ رہنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے حق انہیں کے ساتھ ہے باقی سب لوگ برسر غلط ہیں ۔ یہ کمزوری یا یوں کہنا چاہیئے کہ یہ کم ظرفی ملت کی ایک عمومی بیماری سی بن گئی ہے ۔ میں نے مولانا کی زندگی اس کے برخلاف پائی ۔ جماعت اسلامی کی خوبیاں، اس کی خدمات، اس کی قربانیوں کا ذکر مجھے یاد نہیں

کہ میں نے مولانا کی زبان سے سنا ہو، حالانکہ یہ بات بغیر بیان کئے بھی واضح ہے کہ جماعت کا مقصد اور اس کی تنظیم اور اس کی خوبیاں ظاہر ہے کہ مولانا کے نزدیک مسلّم رہی ہوں گی، ورنہ وہ اس میں شامل کیوں ہوتے اور اس کی قیادت کیوں کرتے اور اپنے جسم کا پورا لہو اس کے لئے کیوں نچوڑتے۔ البتہ اس کے ساتھ میں نے یہ ضرور پایا کہ مولانا کبھی مسلم جماعتوں کی خرابیاں، ان کی کوتاہیاں بیان نہیں کرتے تھے۔ ان کے لیڈروں کے ساتھ حسن ظن رکھتے تھے اور تمام لوگوں کو ملت کا فرد سمجھتے ہوئے ان کے ساتھ معاملہ کرتے تھے مسلم اداروں کو تعاون دیتے تھے اور کارکنانِ تحریک سے تعاون دلاتے تھے۔ میں نے جماعت اسلامی کی خامی بیان کرتے ہوئے تو سنا ہے لیکن دوسروں کی خامی کا تذکرہ کرنا مجھے یاد نہیں آتا ہے، وہ ندوۃ العلماء کے انتظامیہ کے ممبر تھے۔ مدرسۃ الاصلاح کی مختلف کمیٹیوں کے بھی ممبر تھے اور جامعۃ الفلاح کے بھی ناظم رہے اور ممبر تو آخر وقت تک رہے لیکن ان سب اداروں کے ساتھ مولانا کا معاملہ نہایت ہی ہمدردانہ، مخلصانہ اور مساویانہ ہوتا تھا۔ میں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ مولانا کے نزدیک کسی ادارہ کا حق کسی سے کم ہو اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سب ادارے ان کے اپنے ہیں اور اس کے لئے بےچین رہتے تھے۔ ان کی اعلیٰ ظرفی کا یہ حال تھا کہ جب دارالعلوم دیوبند میں ناگفتہ بہ حالات پیدا ہوئے تو وہ شب و روز تڑپتے رہے اور اس کی ہمدردی میں ہر وقت فکرمند رہتے تھے اور اس بات کو کبھی اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیا کہ دارالعلوم کا معاملہ جماعت اسلامی کے سلسلہ میں کیسا معاندانہ رہا ہے، یہاں تک کہ خود ان کے ذمہ داروں اور جمعیۃ العلماء کے قائدین کی غلط فہمیاں دور کرنے کے لئے بھی ان کے سامنے بچھے جاتے تھے اور کبھی ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ وہ کسی بڑی اور منظم تحریک کے قائد ہیں اور بہت بڑے انسان ہیں۔ اس خوبی کی وجہ سے جماعت اسلامی کے حلقوں نے دوسری تنظیموں اور اداروں سے حتی الامکان تعاون کا معاملہ رکھا لیکن اتنا اونچا ظرف یا اتنی اعلیٰ ظرفی [illegible] ہم عصروں میں میں نے پائی البتہ اس معاملہ میں مولانا کا ہم پلہ میں نے جماعت اسلامی میں کسی کو پایا تو وہ مسلم صاحب مرحوم مدیر "دعوت" کی شخصیت تھی۔ وہ جماعتی تعصب

اور تنگ نظری سے کوسوں دور تھے اور ملت کے ہر ہر فرد اور ہر ہر جماعت کی بہی خواہی کے لئے بےچین رہتے تھے۔

۲۔ حالات سے نبرد آزما ہونا بھی ان کی ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ جماعت کے اوپر مشکلات آئیں یا ان کی ذات پر مشکلات آئیں، اس کے مقابلہ میں پہاڑ بن کر کھڑے رہنا ان کی دوسری نمایاں خوبی تھی۔ جماعت اسلامی پر مختلف ادوار میں مشکلات ومصائب کے پہاڑ ٹوٹے اور تیز و تند آندھیاں بھی آئیں۔ ان تمام مواقع پر ہمیشہ مولانا نے اپنے کارکنوں کو یہ ہدایت دی کہ خارجی مشکلات سے نہ کبھی نقصان پہنچا ہے، ورنہ پہونچنے والا ہے نقصان اندرونی کمزوری سے پہنچتا ہے۔ یہی ملت اسلامیہ کی پوری تاریخ ہے۔ مولانا فرماتے کہ آپ اپنے کو ٹھیک رکھئے۔ آندھیاں از خود دب جائیں گی۔ دوسروں پر نظر ڈالنے سے پہلے اپنے اوپر نظر ڈالئے۔ اسی طرح مولانا کی ذات پر بھی مشکلات آئیں اور میں نے پیشانی سے کچھ پڑھنے کی کوشش کی مگر یہ ورق مجھے سادہ ہی ملا۔ پیشانی اور چہرے بشرے سے بھی محسوس نہیں ہوا کہ مولانا کے سامنے ناخوشگوار حالات آئے ہیں۔ چاندپٹی میرا وطن ہے اور مولانا کے مکان سے ملا ہوا ہے۔ اس لئے چاندپٹی کی دیہاتی زندگی سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ دیہات میں رہنا نہایت مشکل کام ہے۔ وہاں کی صعوبتیں برداشت کرلینا کار دارد۔ میں تصور بھی نہیں کرسکتا کہ ایک تعلیم یافتہ اور شہرت یافتہ اور عظیم قائد کس طرح رہ سکتا ہے، جہاں زندگی کی کوئی سہولت حاصل نہیں، بجلی بھی نہیں۔ ماحول اور سوسائٹی بھی نہیں اور کوئی آدمی بات کرنے کے لائق بھی نہیں مگر ان حالات میں نو سال تک مولانا اس طرح سے چاندپٹی میں رہے جیسے وہ مرکز دہلی میں ہیں اور کبھی کسی طرح کی کسی تکلیف کا اظہار ان کی زبان سے نہیں سنا۔ میں نے مولانا سے کئی مرتبہ کہا کہ مولانا آپ کا سب سے بڑا کارنامہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ نے تنہا تحریک اسلامی کے ننھے پودے کو اپنی قیادت میں تناور درخت بنایا اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ خوش دلی اور خندہ پیشانی کے ساتھ چاندپٹی میں رہنا ہے۔ مولانا سنتے تھے اور مسکراتے تھے مگر کوئی جواب نہیں دیتے تھے۔

بس یہ دو چیزیں ہیں میں نے بہت نمایاں طور سے مولانا کے اندر دیکھیں۔

اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے۔

مولانا محمد سلامت اللہ اصلاحی

(مولانا مرحوم کے انتقال کے دوسرے دن جامعہ میں تعزیتی پروگرام ہوا۔ اس موقع پر متعدد معزز مقررین نے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ درج ذیل تقریر مولانا محمد سلامت اللہ صاحب اصلاحی کے وہ تاثرات ہیں جو اس موقع پر سامنے آئے۔ ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے محمد عظیم آلوی عربی چہارم اور طفیل احمد عربی چہارم نے اسے قلمبند کیا۔ ادارہ)

حمد و صلوٰۃ کے بعد مولانا نے فرمایا

اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

اس وقت سچ پوچھئے تو مولانا کا مسکراتا ہوا چہرہ نگاہوں کے سامنے گھوم رہا ہے۔ ان کی میٹھی باتیں کانوں میں رس گھول رہی ہیں۔ مولانا سے میرا تعلق بچپن ہی سے رہا ہے تقریباً میرا تعلق ۴۵ ، ۵۰ سے رہا ہے جس وقت میں نے درسگاہ اسلامی رامپور میں درجہ دوم میں داخلہ لیا تھا۔ اس وقت مرکز جماعت اسلامی ملیح آباد سے رامپور منتقل ہو چکا تھا اور ابتدائی درسگاہ سے قریب واقع تھا۔ ہم لوگوں کی رہائش مولانا کے گھر سے بالکل قریب تھی کہ ان کے یہاں ہر وقت آنا جانا ہوتا تھا۔ اس وقت جو شفقت و محبت ہم کو حاصل ہوئی وہ آخری دم تک قائم رہی۔ اس لئے ان کے انتقال پر ہم لوگوں کی کیا کیفیت ہو سکتی ہے بیان سے باہر ہے۔ مولانا کی شخصیت اتنی دل آویز ہے اتنی پیاری ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس سمت سے ان کی تصویر کشی کی جائے۔ جس سمت سے بھی

تصویر کھینچئے ایک عجیب و غریب مرقع سامنے آتا ہے۔ ہر زاویے سے مکمل تصویر سامنے آتی ہے۔ موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے ہم سب کو دوچار ہونا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مولانا ان عظیم ہستیوں میں سے ایک ہستی تھے جن کے انتقال پر دنیا سے اٹھ جانے کے بعد نہ صرف گھر والے یتیم ہو جاتے ہیں بلکہ نونہالان ملت سب کے سب یتیم ہو جاتے ہیں اور ہم سب اس وقت اسی یتیمی کے شکار ہیں۔ اس وقت جب یہ خبر عالم اسلام کے گوشے گوشے میں پہنچے گی تو تحریک اسلامی سے وابستہ افراد کا کیا حال ہوگا یہ آپ تصور کر سکتے ہیں بالکل وہ بھی آپ ہی کی طرح سے تڑپ تڑپ کر رہ جائیں گے اور ان کی یہ خواہش رہی ہوگی کہ کاش ہم بھی مولانا کے جنازے میں شریک ہو گئے ہوتے اور ہم نے بھی ان کی قبر پر حاضری دے دی ہوتی۔

عزیز طلبہ! مولانا کی کچھ خصوصیات ایسی تھیں جن کے بارے میں آپ نے سب کی تقریروں میں یکسانیت پائی ہوگی یعنی کسی نے یہ نہیں کہا کہ مولانا میں سادگی تھی اور دوسرے نے یہ کہا کہ مولانا میں سادگی نہیں پائی جاتی تھی کچھ صفات مولانا میں ایسی تھیں جن پر ہر شخص کا اتفاق ہے کہ وہ صفات مولانا میں تھیں جب ہم یہ کہتے ہیں کہ مولانا سادگی کا ایک نمونہ تھے تو خالی خولی باتیں نہیں ہیں اس کے سامنے کچھ تو تاریخ ہوگی۔ اتنے واقعات ہیں کہ اگر اس کو گنایا جائے یہاں پر تو ایسے ایسے سیکڑوں جلسے منعقد ہونے سے پوری باتیں سامنے نہیں آسکتیں۔ ظاہر ہے جس شخص کی کتاب زندگی اسّی سالوں پر محیط ہو اس کے اوراق پلٹتے جائیے تین تین گھنٹے کی نشست میں آپ کے سامنے کیا کیا چیزیں گنائی جا سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا گھر دیکھئے ان کے رہن سہن کا انداز دیکھئے کہ اتنے طویل عرصے تک وہ ایک تحریک کے سربراہ رہے ہیں لیکن ان کے گھر کا یہ عالم ہے کہ اگر کسی برسات میں پہلے اس کی مرمت نہ کرائی جائے تو اس میں اٹھنا بیٹھنا مشکل ہو جائے وہ جو اس تحریک پر الزام لگاتے ہیں کہ اس کو بیرونی امداد ملتی ہے میرا تو خیال ہے کہ ان افراد کو گھر کرلایا جاتا اور صرف ان کا گھر دکھا دیا جاتا تو الٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہوتے اور کبھی نام نہیں لیتے کہ تحریک کو بیرونی امداد بھی ملتی ہے۔ مولانا کے اندر عزم و ہمت اور حوصلہ اتنا

زیادہ تھا، ان کے اعصاب اتنے زیادہ قوی تھے کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد یہ مولانا کا ہی دل گردہ تھا کہ انہوں نے تحریک کی نیا کو کھینے کے لئے اس کا ناخدا بننے کے لئے اپنے کو آمادہ کرلیا کتنے نامساعد تھے وہ حالات! کتنا پُرآشوب تھا وہ دور! اس کا صحیح اندازہ وہی لوگ کرسکتے ہیں جو اس دور میں موجود تھے اور آپ نے کچھ لوگوں کی تقریروں میں سنا بھی ان نامساعد حالات میں جب کہ نہ صرف غیروں کی طرف سے تیروں کی بوچھار ہو رہی تھی بلکہ اپنوں کی طرف سے بھی، کہیں جماعت کے خلاف سازشیں ہو رہی تھیں۔ مختلف سمتوں سے طنز اور طعن وتشنیع کے تیر برس رہے تھے۔ اس وقت آپ نے تحریک کی نیا کو کھینے کا بیڑا اٹھایا اور طوفان سے ٹکراتے ہوئے پیہم آگے بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ وہ چھوٹی سی ناؤ ایک زبردست جہاز بن چکی ہے کہ اس سے جو بھی ٹکراتا ہے پاش پاش ہو جاتا ہے۔ اس کو کوئی بھی ہستی اس وقت نقصان نہیں پہونچا سکتی۔

کل مولانا صدرالدین کی خدمت میں موجود تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ دورہ بہت ہی شدید ہے۔ لیکن یہ مولانا کا تحمل ہی ہے کہ ان کو دیکھنے سے محسوس نہیں ہو رہا ہے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ تم مولانا کے تحمل کی بات کرتے ہو۔ ۴۴ سال تک میرا ان کا ساتھ رہا ہے اس دوران ایسے کتنے ہی نامساعد حالات آئے جن کہ ہم لوگوں کے قدم ڈگمگا گئے۔ ہم لوگ تو بس ہاتھ پاؤں چھوڑ کر بیٹھ گئے۔ لیکن مولانا کے چہرے پر کبھی ہم نے کسی طرح کا خوف وہراس، پریشانی کے آثار محسوس نہیں کئے۔ تحریک اسلامی کی سربراہی کے دوران مولانا کی اہلیہ سخت بیماری کا شکار ہوئیں آدمی جب گھر کے باہر کے جھمیلوں سے ہلکان ہو جاتا ہے تو سوچتا ہے کہ گھر پر اس کو کچھ سکون وآرام مل جائیگا لیکن ایک طویل عرصہ ایسا گزرا ہے کہ گھر کا پورا نظام درہم برہم، اہلیہ کی حالت اتنی شدید کہ بس بیان سے باہر اور پھر وہ وقت بھی آگیا کہ وہ داغ مفارقت دے کر چلی گئیں[1]۔ ان حالات میں کس طرح سے تحریک اسلامی کو لیکر آگے بڑھتے رہے۔ آپ اس کو سوچ بھی نہیں سکتے۔ ایمرجنسی کے زمانے میں مولانا گرفتار ہوئے...... ہم لوگ ان سے ملنے کے لئے اعظم گڈھ جیل میں گئے تو مولانا نے کہا کہ میرے وہ رفقاء جو اس موقع پر باہر ہیں ان کے

---

[1] دوران تقریر مولانا نے بعض مزید گھریلو حالات کا ذکر کیا جن کا ذکر ابھی یہاں پر مناسب نہیں ہے۔

جا کر کہہ دینا کہ وہ آکر جیل کی کال کوٹھریوں کا کبھی کبھی نظارہ کرلیا کریں۔ اس سے ان کے عزم و حوصلے میں بلندی آئے گی اور ہمت میں اضافہ ہوگا۔ اسی طرح سے معاملہ فہمی ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ کسی بھی مسئلے کا فوری حل تلاش کرلینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ پیش کرتا ہوں۔ چند سال پہلے مدرسۃ الاصلاح کے ناظم مولانا ابوالحسن علی فراہی صاحب کا انتقال ہوگیا مولانا بدرالدین صاحب پہلے ہی مستعفی ہو چکے تھے۔ اس لئے ان کی طرف کسی کا ذہن نہیں جا رہا تھا اور اس بات کا اندیشہ تھا کہ اس مسئلے میں لوگوں میں زبردست ٹکراؤ ہوگا۔ نشست شروع ہوئی تو کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اس موقع پر مولانا بھی پہنچ گئے۔ مولانا نے مولانا بدرالدین صاحب کا نام نظامت کے لئے پیش کردیا جتنے لوگ تھے سب کے سب ہکا بکا رہ گئے، جو جہاں تھا وہیں خاموش ہو گیا نہ کوئی طوفان اور نہ کہیں کوئی لہریں یہ اہم کام سکون کے ساتھ انجام پا گیا اسی طرح کے حالات یہاں کی مجلس انتظامیہ میں بھی پیش آتے رہے ہیں چند سال پہلے یہاں ایک دستور تیار ہوا تھا اور اس دستور کے سلسلے میں جگہ جگہ نشستیں ہو رہی تھیں کہ کس کس طرح کی ترمیمات کی جائیں۔ کیا کیا انہیں شقیں رکھی جائیں کن کن دفعات کو ہٹایا جائے اور کن کا اضافہ کیا جائے۔ اس موقع پر مولانا بھی تشریف لے آئے مولانا نے مجلس کے آغاز ہی میں پوچھ لیا کہ ــــ دستور کمیٹی میں کون کون فرد تھے معلوم ہوا فلاں فلاں افراد تھے۔ مولانا نے دریافت کیا کہ اس دستور کی تشکیل میں آپ لوگ شریک رہے ہیں، معلوم ہوا کہ کمیٹی کے بعض ممبران اس دستور سازی میں شریک نہیں تھے مولانا نے فرمایا کہ اس دستور کی تشکیل ہی غیر دستوری ہے۔ تو بھلا اس پر کیا غور کیا جائے۔ پھر مولانا نے فرمایا کہ اس دفتر کو لپیٹ کر رکھ دیجئے بعد میں دیکھا جائے گا چنانچہ وہ دفتر آج تک لپیٹ کر رکھا ہوا ہے۔ مولانا کی خودداری کے کچھ واقعات میرے ذہن میں ہیں۔ مولانا انتہائی خوددار واقع ہوئے تھے خودداری کا یہ عالم تھا کہ دہلی جیسی جگہ جہاں باہر کے مہمان عام طور پر آتے رہتے ہیں کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے بارے میں ہمیں علم ہے کہ مستقل اس چکر میں رہتے ہیں کہ کب کوئی ایرپورٹ پر اترے اور ہم ان کو ساتھ لیکر چلیں اپنے حلقوں میں ان کو گھمائیں پھرائیں اور ان کو اپنی خدمات دکھلائیں کسی اور ادارے کی جھلک نہ ملنے پائے اور کچھ اور

اور اب بھی دعوت دین کے کام میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ اس کی ان کو اطلاع نہ ملنے پائے مولانا اس طرح سے نہیں سوچتے تھے۔ مولانا نے کہا ہم تو اپنے دیدہ و دل کو فرش راہ کرنے کیلئے تیار ہیں کوئی بھی ہمارے پاس آسکتا ہے ہمارا دفتر کھلا ہے پورا مرکز کھلا رہتا ہے، مہمانوں کی آمد کی کوئی بھی اطلاع آئے ہم ان کا استقبال کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ باقی یہ کہ ہم ہر ایک کے ساتھ گھومیں، دوسروں کے بارے میں ان کو بدظن کریں، صرف اپنی ہی دینی خدمات کی دھونس جمائیں، یہ سب باتیں ہمارے بس سے باہر ہیں۔

یہ ان کی خودداری ہمیشہ ان کے ساتھ لگی رہی۔ ایک مرتبہ مکہ مکرمہ میں ایک نشست چل رہی تھی اس میں جناب حسن مُظفّر صاحب بھی تھے جو رابطہ عالم اسلامی کے انگلش جرنل کے ایڈیٹر ہیں، پاکستانی ہیں اور اس وقت ان کو برٹش نیشنلٹی بھی ملی ہوئی ہے انہوں نے مولانا سے ہندوستانی مسلمانوں کے حالات، ان کے مسائل و مشکلات کے بارے میں دریافت کیا، مولانا نے قدرے تفصیل سے حالات بیان فرمائے۔ تو انھوں نے فرمایا کہ مولانا جب یہ صورت حال چل رہی ہے، مسلمان جب اس قدر مسائل سے دوچار ہیں اور وہاں پر کام کرنے کے لئے اتنی ضرورت ہے روپے پیسے کی، تو آپ لوگ خاکہ بنا کر کیوں نہیں پیش کرتے۔ کہ اس کے سلسلے میں یہاں سے تعاون مل سکے تو مولانا نے کہا کہ تم کیا چاہتے ہو؟ ہندوستانی مسلمانوں کے حالات کس سے مخفی ہیں؟ ان لوگوں میں سے کون نہیں جانتا کہ ہندوستانی مسلمان کن پریشانیوں سے دوچار ہیں، وہ کن حالات سے گذر رہے ہیں کیا یہ چاہتے ہو کہ کاسۂ گدائی لیکر ہر جگہ گھوما جائے۔ یہ کہنا تھا کہ محفل پر سناٹا چھا گیا۔

مولانا چاہتے تھے کہ جماعت اسلامی کا دستور واقعی کتاب و سنت سے مستنبط دستور ہو۔ مختلف حلقوں سے سوالات اٹھائے جارہے ہیں کہ جماعت اسلامی کے دستور میں صحابہ کرام کو تنقید و تنقیص کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اور مختلف چیزیں ہیں جو کتاب و سنت سے اس دستور میں متعارض ہیں اس بار مولانا مکہ مکرمہ تشریف لائے تو ہم لوگوں کو بلوایا اور کہا کہ چلو شیخ بن باز سے ملنا ہے۔ شیخ بن باز کا پورا نام عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز ہے یہ عالم اسلام کے چوٹی کے عالم و فاضل، انتہائی متقی و پرہیزگار انسان ہیں اور بہت

سی صفات کے مالک ہیں اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز فرمائے۔ ان کی مجلس میں پہونچے تو مولانا نے شیخ سے کہا کہ میں جماعت اسلامی کے دستور کا عربی ترجمہ لایا ہوں۔ آپ کو پڑھ کر سناتا ہوں اس میں آپ کو کوئی بات کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کے خلاف ملے تو بلا تامل اور بلا چون و چرا اس کی نشاندہی فرمائیں، ہم اس پر سنجیدگی سے سوچیں گے چنانچہ کچھ دیر مولانا ان کو دستور سناتے رہے۔ شیخ صاحب نے کہا کہ آپ اس کو چھوڑ دیجئے میں اطمینان سے اس کا مطالعہ کروں گا اور اگر اس میں کوئی بات ملی تو آپ کو باخبر کروں گا۔ آج تک اس طرح کی کوئی بات شیخ صاحب کی طرف سے سننے میں نہیں آئی۔ مولانا کو یقین آگیا کہ جماعت اسلامی کا دستور واقعی کتاب و سنت سے مستنبط دستور ہے، یہ جو لوگ اعتراضات کرتے پھرتے ہیں ان میں کوئی جان نہیں ہے شیخ صاحب کے حلقے میں سلفی بھائی لوگ اس طرح کی حرکتیں کانی کرتے ہیں تو مولانا نے مناسب سمجھا کہ ہم لوگ بلا واسطہ ان سے ملیں۔ اور اپنے دستور کو بلا کم و کاست صحیح طور سے پیش کردیں اگر واقعی کوئی قابل اعتراض چیز ہو تو اس سے رجوع کرلیں۔

اسی طرح میں ان کی امانت و دیانت کا واقعہ سنا دوں۔ ایک بار مکہ مکرمہ تشریف لائے اور شیخ بن باز سے ملنے گئے چند سالوں پیشتر آسام میں سنگین فساد ہوا تھا جس میں جماعت نے ۲۵ سے ۲۶ لاکھ روپئے تک ریلیف تقسیم کیا تھا۔ دارالافتاء کی طرف سے شیخ بن باز نے بھی اس سلسلے میں کچھ تعاون کیا تھا۔ ان کی رقم بعد میں پہونچی کچھ اس میں لگ گئی کچھ باقی رہ گئی مولانا شیخ کی خدمت میں پہونچے اور کہا کہ آپ نے اتنی رقم بھیجی تھی جس میں اتنی رقم لگ گئی اور اتنی بچ گئی ہے آپ اس کے بارے میں جیسا فرمادیں ویسا ہی کروں گا۔ شیخ ہکا بکا رہ گئے۔ اسلئے کہ آج تک انکے پاس شاید ہی کوئی ایسا شخص پہنچا ہو جو باقی ماندہ رقم کا حساب لایا ہو۔ شیخ صاحب نے کہا ہم نے تو آپ کو امین سمجھا ہے آپ پر اعتماد کر کے ہی وہ رقم آپ کے حوالے کی ہے۔ آپ اس کو آسام فنڈ میں لگائیں یا یوپی بہار فنڈ میں لگائیں۔ ہم کو اس سے کوئی مطلب نہیں۔ اور یہی نہیں شیخ صاحب کا حافظہ اتنا مضبوط ہے کہ انہوں نے کہا کہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس مد کی کچھ رقم بچ رہی ہے

بقیہ صفحہ ۱۱۸ پر

جاوید سلطان اعظمی

مولانا مرحوم کی زندگی کی ۲ باتیں

(جامعۃ الفلاح میں تعزیتی جلسہ کے موقع پر جاوید سلطان اعظمی کی تقریر)

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

مولانا مرحوم رشتے میں میرے دادا (دادی کے بھائی) لگتے تھے ان کی سیرت و کردار اور زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ہمارے اساتذہ کرام نے آپ حضرات کے سامنے باتیں رکھی ہیں۔ میں مولانا مرحوم کے سلسلے میں صرف دو باتیں آپ حضرات کے سامنے رکھوں گا۔

۱۔ مولانا مرحوم جماعت کی ذمہ داریوں اور اپنی دوسری مشغولیتوں کے باوجود اپنے اعزہ و اقرباء کا بہت ہی زیادہ خیال رکھتے تھے۔ مولانا مرحوم جب بھی دہلی سے اپنے گاؤں تشریف لاتے اس کے دوسرے ہی دن اپنی بہن سے ملنے ضرور جاتے اور بارہا ایسا ہوتا کہ اپنے ساتھ لیکر چاند پٹی آتے اور جب تک چاند پٹی آپ کا قیام رہتا دادی کو اپنے ساتھ رکھتے اور پھر جانے سے پہلے پہلے پھوپھی کو پہنچا دیا کرتے اور دادی جان کو ہمیشہ ہی کچھ نہ کچھ ضرور پیش کرتے وہ انکار کرتیں کیونکہ انھیں مولانا مرحوم کی تنگیوں کا بخوبی علم تھا لیکن مولانا اصرار کرتے کہتے کہ تمہارا میرے اوپر حق ہے۔ تم میری چھوٹی بہن ہو بالآخر دادی کو قبول ہی کرنا پڑتا۔

ابھی ایک سال پہلے میں دہلی گیا تھا اور ایس آئی او کے مرکز میں میرا قیام تھا مولانا کو کسی طرح معلوم ہوگیا کہ میں دہلی آیا ہوا ہوں مولانا نے مجھے بلوایا اور بڑی ناراضگی کا اظہار کیا کہ میرے رہتے ہوئے تم وہاں کیوں تھے۔ میں کھانا کھا کر گیا تھا اور کھانے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی لیکن مولانا نے اتنا اصرار کیا کہ مجھے دسترخوان پر بیٹھنا ہی پڑا۔

ابھی جب آپ بیمار تھے تو میں ان کی عیادت کو گیا، دروازہ کے سامنے کمپاؤنڈر کھڑا تھا، اس نے جانے سے منع کیا میں نے کہا مولانا سے بتا دو کہ فلاں ملنا چاہتا ہے اگر اجازت دیں گے تو ٹھیک ہے ورنہ میں واپس چلا جاؤں گا۔ مولانا کو جوں ہی میرے آمد کی اطلاع ہوتی ہے فوراً آواز دیتے ہیں اور ان کی ناک میں نلی لگی ہوئی تھی لیکن پھر بھی اپنے پاس بٹھاتے ہیں اور تھوڑی خیریت وغیرہ پوچھتے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ آپ کو بات کرنے میں تکلیف ہوتی ہے اس لئے زیادہ دیر تک بیٹھنا مناسب نہیں سمجھا (مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ آخری ملاقات ہوگی) جاتے جاتے میں نے پوچھا کہ اگر آپ حکم دیں تو آپ کی بیماری کی اطلاع میں دادی جان کو دے دوں مولانا نے جواب دیا۔ کمزور ہو چکی ہے اس کو یہاں آنے اور یہاں رکنے میں تکلیف ہوگی اس لئے تم گھر نہ جاؤ بلکہ مدرسہ سے آئے ہو مدرسہ ہی جاؤ خدا تمہیں کامیاب کرے۔

۲۔ مولانا اپنے اصولوں کی سختی سے پابندی کرتے تھے اور اس سلسلے میں خواہ کوئی کتنا ہی قریبی رشتہ دار کیوں نہ ہو کسی طرح کی مداہنت کے قائل نہیں تھے۔

ایک مرتبہ میں نے ایک یونیورسٹی میں داخلے کے سلسلے میں مولانا مرحوم سے سفارش کی درخواست کی آپ نے جواب دیا۔ عزیزم مجھے بہت افسوس ہے میں تمہارا یہ کام نہیں کر سکتا۔ میرے کچھ اصول ہیں اور اب تک میں نے ان اصولوں کی پابندی کی ہے اور آخر میں تم مجھے مجبور نہ کرو۔

یہ تھیں مولانا مرحوم کی زندگی کی ابھری ہوئی دو نہایت اہم صفات۔

اب آخر میں میں اللہ تعالے سے مرحوم کے لئے مغفرت اور پسماندگان کے لئے صبر جمیل کی دعا کرتا ہوں۔ آمین۔

بقیہ ایک شمع رہ گئی تھی

پاس اور بھی موجود ہے پھر سکریٹری کو بلایا اور کہا کہ اس مد کی فلاں رقم مولانا کے حوالے کردو۔ ان کو اختیار ہے اس رقم کو جہاں چاہیں استعمال کر سکتے ہیں اس طرح سے مولانا کا انداز فکر تھا دیانت و امانت کے سلسلے میں۔

مولانا کوثر اعظمی
نائب ناظم مدرسۃ الاصلاح سرائمیر
اعظم گڈھ

ابتلا بھی ہے تو کیسی ابتلا یہ اے خدا

کم قیامت سے نہ تھا کچھ سامنا منجدھار کا ۔ اور پھر طرفہ ستم یہ چھوٹنا پتوار کا
حشر ساماں کس قدر ہے اور کتنا جانگسل ۔ کیا کہا جائے کہ ہے یارا کسے اظہار کا
پوچھئے پھر کیا ہوا کیا ہے عالم دہشت نواز ۔ ربط باہم دل سے ہو جب دیدۂ خونبار کا
حادثہ کتنا بڑا ہے یہ دلِ غازی سے پوچھ ۔ معرکے میں ٹوٹ جانا تیغ جوہر دار کا

ابتلا بھی ہے تو کیسی ابتلا یہ اے خدا
قافلے سے روٹھ جانا قافلہ سالار کا

آہ مولانا ابو اللیثؒ آپ کی رحلت کے بعد ۔ یکسر ہے عالم دگرگوں حلقۂ اخیار کا
اہلِ ندوہ زار و قطار ہیں ، اصلاح و فلاح ۔ رہ گئے ہیں بن کے نقش اک درد کے آزار کا
خوں رُلائے گا ہمیں اک عمر اب آ آ کے یاد ۔ آپ کا شفقت بھرا انداز وہ گفتار کا
سادگی و دلنوازی ، دردمندی کی ادا ۔ اور وہ من موہنا طرز آپ کے اطوار کا

جرأت بیباک بہرِ برملا اظہارِ حق
بے ریا ، بے لوث پہلو آپ کے کردار کا

موڑ لینا تھا یوں جب کہ سفر سے رخ ابھی ۔ تھا سفر جاری ابھی تو جادۂ پرخار کا
تھا ابھی کچھ دیر رہنا اور بھی سینہ سپر ۔ سلسلہ قائم ابھی تھا یورشِ ادبار کا
تھا ابھی تو مرحلہ پنجہ نوازی کا دراز ۔ تھا ابھی طالب زمانہ آپ سے غمخوار کا

ایک عالم تھا ابھی محتاج بہر آشتی
آپ کے اخلاص و حق نفع کا ، ایثار کا

آڑے وقتوں میں بنے گا اب سہارا کون پھر ۔ ڈگمگاتی وا ڈگوں تحریک کی دیوار کا
حوصلہ خاطر شکستوں کا بڑھا کر کون اب ۔ راہ لے گا روک بڑھ کر تفتت کی یلغار کا
رخ نہ دے گا کون پھرنے جانب ناراستی ۔ کاروان شوق کی منزل طلب رفتار کا
کون ان اپنوں کو دے صلح جوئی کا پیام ۔ طور جو اپنا بنا لیں بھول سے اغیار کا
کون اب روکے گا بن کر صورت کوہ گراں ۔ راستہ باندھے پرا اب ناوکِ اشرار کا
آپ گذرے ہم بھی آتے ہیں ذرا اک دیر بعد ۔ مرحلہ درپیش ابھی ہے عرصۂ پیکار کا

زندگانی کی حقیقت بیش ازیں کوثر نہیں
آنا جانا ایک سایہ ابر رعشہ دار کا

---

۱ جماعت اسلامی ہند۔
۲ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اعظم گڈھ۔
۳ دار العلوم ندوۃ العلماء۔
۴ جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڈھ۔
۵ بعد تقسیم جماعت اسلامی کی تنظیم نو اور اس کی سربراہی۔
۶ تقسیم کے بعد پاکستان مسلمانوں کی منتقلی کی رو روکنے کیلئے مولانا کا عملی جہاد
۷ پارلیمنٹری سیاست سے مسلمانوں بالخصوص جماعت اسلامی کو باز رکھنے کی کوشش۔
۸ جماعت اسلامی کے خلاف فتویٰ بازی کی مہم اور مولانا کا صلح جویانہ رویہ۔

(بقیہ مولانا ابو اللیثؒ کی شخصیت کے چند پہلو)

اللہ تعالیٰ مولانا کی خدمات کو شرف قبولیت بخشے ان کی چھوٹی موٹی فروگذاشتوں کو معاف فرمائے اپنے جوار رحمت میں انہیں جگہ دے اور جنت الفردوس کے اعلیٰ درجات انہیں نصیب فرمائے اور ہم سب سوگواران کو ان کی اچھی باتوں کو اپنانے اور ان کی طرح دین کی خدمت میں اپنے آپ کو تج دینے کی توفیق خیر عطا فرمائے۔ آمین!
یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الیٰ ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔

نعیم صدیقی

ابواللیث بے لوث (مرحوم)

انسانی زندگی کا یہ کمال ہے کہ وہ موت کی کھنچی ہوئی تلوار کے نیچے ساری عمر گزارتے ہوئے رفعتوں میں بھی کمال حاصل کرتا ہے اور پستیوں میں بھی۔

مولانا ابواللیث اصلاحی نے بہت سی رفعتوں کی چوٹیوں کو سر کیا، مگر آخر وہ لمحہ آ پہنچا جب موت کی تلوار نے سانس کی ڈوری کو کاٹ دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

جو دوست ہم سے چھن ہے وہ گراں بہا تھی۔ وہ ہم اسلام کی سربرآوردہ شخصیت، جید عالم دین ہندوستانی معاشرے کی پیچیدگیوں کے رمز شناس اور جماعت اسلامی ہند کی فکری اور عملی دوگونہ مشکلات کے رازداں، ۸۰ سال کی عمر میں دار الامتحان سے دار الجزاء میں جا پہنچے، اللہ تعالیٰ کی نگاہ کرم، مغفرت رضا اور خوشنودی کے پھول اُن کی روح پر برساتے ہوئے آسے اس مبارک منزل کی طرف لے چلے جو خاص ہے رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ کے لئے۔

یکم دسمبر کو اپنے وطن چاند پٹی میں دل کا دورہ پڑا، رات بارہ بجے اعظم گڑھ ہسپتال میں لے جائے گئے، ۲ دسمبر کی شام کو پھر دورہ پھر ڈاکٹر فرقان صاحب نے انہیں اپنے نرسنگ ہوم میں منتقل کر لیا۔ دہلی کے مرکز جماعت کو اطلاع ۳ دسمبر کو ملی۔ مرکز سے دو اصحاب روانہ ہو گئے۔ ۳ اور ۴ کو دواؤں اور دعاؤں کا سلسلہ جاری رہا، ۵ دسمبر کو بوقت صبح (دس بجے) انتقال ہو گیا۔ یہاں منصورہ میں اطلاع پہنچی تو ساری فضا پر حزن و ملال چھا گیا۔ ہمارے یہاں سے ایک محترم رفیق نے بھارت جانے کے لئے ویزا لینے کی کوشش کی، مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر FEX کے ذریعے لکھے ہوئے تاثرات بھیجے گئے اور بے بسی کے عالم میں دعائیں جاری رہیں۔

مولانا ابواللیث جن کا اصل نام شیر محمد تھا، تقسیم ملک کے بعد بھارت کی جماعت اسلامی کے اول روز سے امیر مقرر ہوئے، اور مسلسل ۲۲ سال اس منصب پر فائز رہ کر مولانا مودودیؒ کے خالی کردہ مقام سے ارکان اور کارکنوں کی جھوٹی [illegible] ن کا مقابلہ بھی کیا اور پھر بھارت میں

دعوتی اور سیاسی کام کے لئے وہاں کے حالات کے مطابق کچھ خطوط مجلس شوریٰ کی مدد سے معین کیے۔ حکومت کی ترچھی نگاہوں کے ساتھ متعصب ہندوؤں کے مسلم کش فسادات کے طوفانوں کے درمیان، اپنے رفقاء کے ایمان و کردار کو مضبوطی سے بچائے رکھنا، بلکہ اُلٹا مخالف قوتوں پر اپنے اخلاقی اصولوں اور معتدل مسلک کے ذریعے اثر انداز ہونا ایک ایسی صورت حال ہے کہ دنیا بھر میں تحریک اسلامی کے کارکنوں کو اس کا اچھی طرح سے مطالعہ کرنا چاہیے۔

۱۹۷۲ء میں مولانا محمد یوسف صاحب امیر منتخب ہوئے۔ مگر ۱۹۸۱ء میں دوبارہ رفقائے جماعت نے مولانا کو امیر جماعت اسلامی (بھارت) چنا اور وہ ۹ سال اسی منصب پر رہے۔

ابواللیث اصلاحی ندوی صاحب اور مولانا محمد یوسف صاحب کے مجموعی کام کے نتیجے میں نہ صرف اچھے معیار کے ارکان اور کارکن تیار ہوئے بلکہ وسیع لٹریچر، شعر و ادب کی تخلیق، اعلیٰ پایہ کے تحقیقی کام، مردانہ اور زنانہ درس گاہوں کا قیام، نصابی کتابوں کی تیاری، تبلیغی سرگرمیاں جن کا بہت بڑا حاصل ہندوؤں کی ستائی ہوئی نیچ ذات کے ہندوؤں کا خاص طور پر تعداد میں اسلام قبول کرنا (خصوصاً جنوبی ہند میں) اور ان کے لئے تعلیم و تربیت کا انتظام — اور پھر بنیادی طور پر مخالف مزاج اکثریت کی حکومت کی زد سے بہ صد احتیاط اپنے حلقۂ اثر کو بچا کر نکالنا اور اُردو، انگریزی اخبارات کو بھی اپنے اصولی معیارات کی پابندی میں مسلسل جاری رکھنا، اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ کبھی کبھی ہم آزاد اور اکثریتی مملکت والے مسلمانوں کو شرم سی محسوس ہوتی ہے۔

اس دردناک نقصان پر ہم اپنا اظہار درد اور اظہار ہمدردی اولاً جناب مولانا سراج الحسن موجودہ امیر جماعت اسلامی بھارت و قیم جماعت محمد جعفر صاحب اور ثانیاً جملہ برادران مرکز، تمام رفقائے تحریک اور ثالثاً مولانا کے اہل خانہ و اہل خاندان سے کرتے ہیں۔ خدا مرحوم پر مغفرت نازل کرے۔

(بشکریہ ترجمان القرآن لاہور)

مولانا ضیاء الدین اصلاحی

آہ! مولانا ابواللیث صاحب

قارئین کو اخباروں سے جماعت اسلامی ہند کے سابق امیر مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی کی المناک وفات کی خبر مل چکی ہوگی، موت سے کسی کو مفر نہیں، لیکن مسلمانوں میں پہلے ہی سے قحط الرجال ہے، بے غرض، بے ریا اور اخلاص سے کام کرنے والوں کا فقدان ہے، وہ بڑے نازک اور پُرآشوب دور سے گذر رہے ہیں، ان کی مشکلات اور دشواریاں سوا ہوتی جارہی ہیں، ان کے مسائل کی پیچیدگی اور الجھاؤ میں برابر اضافہ ہو رہا ہے، اور قومی و ملی زندگی کے ہر شعبہ میں نہ پُر ہونے والا خلا بڑھتا جارہا ہے، ان حالات میں صف اول کے ایک صائب الرائے، تجربہ کار، معتدل مزاج، پُرخلوص اور دردمند رہنما کا اٹھ جانا کس قدر حسرتناک ہے، اس کا جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے، جماعت کے باہر کے لوگ بھی ان کی فہم و فراست، شرافت و سلامت روی، دوراندیشی اور معاملہ فہمی کے پوری طرح معترف تھے۔

امارت کے منصب سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ اپنے گاؤں چاند پٹی (اعظم گڈھ) میں رہنے لگے تھے، یہیں یکم دسمبر کو فجر کی نماز جماعت سے ادا کرنے کے بعد حسب معمول ٹہلنے نکلے، تھوڑی دور جانے کے بعد تکلیف اور کمزوری محسوس کی اس لئے گھر لوٹ آئے، مقامی ڈاکٹروں کے علاج سے آرام نہ ہوا تو اسی روز شب میں اعظم گڈھ لائے گئے، دو رات اپنے عزیز ڈاکٹر فرقان احمد کے گھر پر گذار کر ۳ دسمبر کو ان کے نرسنگ ہوم میں داخل ہوئے، میں صبح و شام دیکھنے جاتا، صرف ایک روز کچھ بات چیت ہوئی، بڑا شدید قلبی دورہ تھا، بس یہی کہتے "اے اللہ رحم فرما" آخر ۵ دسمبر کو ۱ بجے دن اللہ نے ان پر رحم کیا اور اپنے یہاں بلا لیا، اسی دن ۴ بجے شام ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں پیوند خاک ہوگئے۔ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى۔

تعلیم کی تکمیل ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ہوئی لیکن اس سے پہلے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں رہے جس سے ان کا تعلق ہمیشہ گہرا رہا، ۱۹۳۳ء میں فراغت کے بعد وہ ندوہ ہی میں تدریس کی خدمت انجام دینے لگے، اس تابناک دور میں شیخ تقی الدین ہلالی مراکشی کی خدمات بھی ندوہ کو حاصل ہو گئی تھیں، جن سے استفادہ کرنے والوں میں یہ بھی پیش پیش رہے، شیخ کے فیض سے عربی بولنے اور لکھنے کی جو اچھی مشق ہوگئی تھی وہ آخر تک باقی رہی، اسلام اور مستشرقین پر دارالمصنفین کے بین الاقوامی سیمینار کے لئے انھوں نے عربی زبان ہی میں اپنا مقالہ لکھا تھا، اسی زمانہ میں ندوہ سے مولانا سید سلیمان ندوی اور ہلالی صاحب نے ایک عربی رسالہ "الضیاء" کے اجراء کا فیصلہ کیا، مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم تو اڈیٹر ہی تھے، دوسرے گنے چنے مضمون نگاروں میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا محمد ناظم ندوی کے علاوہ ان کا نام بھی تھا، اس کے لئے انھوں نے متعدد اچھے اور مفید مضامین بھی لکھے اور حضرت سید صاحبؒ کے مضمون "ہندوستان میں علم حدیث" کا عربی ترجمہ بھی کیا۔

۱۹۳۵ء میں وہ بجنور تشریف لے گئے اور مشہور قوم پرور اخبار "مدینہ" بجنور کے شریک ادارت ہوئے، یہیں سے ان کی ادارت میں ایک علمی و دینی ماہنامہ "فاران" نکلا، ۱۹۳۶ء میں مولانا شبلیؒ اور مولانا حمید الدین فراہیؒ کے خلاف غوغائے تکفیر بپا ہوا، اور ایک صاحب کا رسالہ "علامہ سید سلیمان ندویؒ کی قرآنی غلطیاں" شائع ہوا تو انھوں نے اس میں ان کے مدلل جواب لکھے، ۱۹۳۶ء ہی میں مولانا امین احسن اصلاحی کی ادارت میں "الاصلاح" نکلا، جس کے خاص مضمون نگاروں میں مولانا ابواللیث بھی تھے، اس میں ان کا ایک اہم مضمون "قرآن مجید میں تکرار کی نوعیت اور قصۂ آدم" کئی نمبروں میں شائع ہوا، بجنور سے وہ مدرسۃ الاصلاح آگئے اور "الاصلاح" بند ہونے پر اس سے ملتا جلتا رسالہ "اصلاح" ان کی ادارت میں شائع ہوا، مگر وہ شعلۂ مستعجل نکلا۔

ندوۃ العلماء ہی میں ان پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی متکلمانہ تحریروں کا اثر ہونے لگا تھا، خود ان کے مضامین بھی ترجمان القرآن میں چھپتے تھے، جماعت اسلامی کے قیام کے بعد وہ اس میں شامل ہوگئے اور اب انتقال کے بعد ہی اس سے علیحدہ ہوئے، اس راہ میں قید و بند اور ہر طرح کی صعوبتیں جھیلیں، ملک کی تقسیم کے بعد ۱۹۴۸ء میں ہندوستان کی جماعت کے امیر ہوئے درمیان کے چند برسوں کو چھوڑ کر قیادت مسلسل ان ہی کے پاس رہی، جناب سید صلاح الدین

عبدالرحمٰن مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ اتنے طویل عرصہ تک مسلمانوں کی کسی جماعت کا امیر بنے رہنا معجزہ ہی ہے، انھوں نے قومی کارزار میں جب قدم رکھا تھا تو کسی کو وہم و گمان بھی نہ رہا ہوگا کہ وہ اس خوش اسلوبی کے ساتھ جماعت کو انتشار سے بچا کر اسے وسعت و ترقی دیں گے لیکن ان کے تدبر اور انتظامی قابلیت کے جوہر اسی وقت کھلے، دراصل اس کے لئے جس پختہ سیرت، اعتدال طبع اور اولوالعزمی کی ضرورت ہے وہ ان میں بدرجۂ اتم موجود تھی، امارت کے زمانہ میں ملک و ملت کے مسائل پر ان کے مفید خیالات ''زندگی'' رام پور میں شائع ہوئے اور بعض کتابیں بھی لکھیں۔

ان کی وسعت اخلاق نے ان کو تمام حلقوں میں مقبول بنا دیا تھا، جماعت کے مخالفین بھی ان کا لحاظ و احترام کرتے تھے، وہ مہر و مروت کے پتلے، ہر شخص کے ہمدرد اور مرنج و مرنجان شخص تھے، اپنے نیازمندوں اور خوردوں سے بھی خوش اخلاقی اور بشاشت سے پیش آتے اور نہایت بے تکلفی سے باتیں کرتے تھے، ان میں نخوت و رعونت کا کوئی شائبہ بھی نہ تھا، سادگی، اخلاص، دردمندی، خاکساری اور فروتنی ان کی سیرت کی ممتاز خصوصیتیں تھیں جو ہر شخص کو متاثر کر لیتی تھیں، ان کا رتبہ بڑا تھا مگر انھوں نے کبھی نہ اپنے کو بڑا سمجھا اور نہ یہ ظاہر کیا کہ وہ مسلمانوں کی بہت منظم اور با اثر جماعت کے امیر ہیں، دوسروں کی تحقیر اور در پردہ اپنی بڑائی کا اظہار ان میں نہ تھا، نام و نمود سے بڑی نفرت تھی، دنیاوی جاہ و مال کی کبھی ہوس نہ کی، ان کی ساری عزت و شہرت اور نیک نامی ان کی ذاتی لیاقت، محنت اور خلوص کے ساتھ کام کرنے کی وجہ سے تھی، دراصل یہی بڑائی پائیدار ہوتی ہے۔

دارالمصنفین سے ان کو ہمیشہ بڑا تعلق رہا، وہ حضرت سید صاحبؒ کے عزیز شاگرد تھے، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن سے ان کے بڑے مخلصانہ روابط تھے، مجھ پر غیر معمولی شفقت فرماتے تھے، وہ جب اعظم گڑھ آتے تو دارالمصنفین ضرور آتے، اللہ تعالیٰ ان کے مراتب و درجات بلند کرے، آمین۔

(بشکریہ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ)

• محمد اسمٰعیل فلاحی

''وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں''

ہندوستان کے ٹکڑے ہو چکے تھے۔ تقسیم کی قینچی اپنا کام کر چکی تھی۔ تعصب اور مذہبی جنون کے خون آشام عفریت نے ہزاروں افراد کو نگل لیا تھا۔ ہزاروں بچے یتیم، ہزاروں دوشیزائیں بیوہ اور لاکھوں افراد خانماں برباد ہو چکے تھے۔ ہندوستان میں رہ جانے والا مسلمان شاخ بریدہ کے مانند تھا۔ بے سہارا، لاوارث، یاس و قنوط میں گرفتار، حیرت و استعجاب کی تصویر پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ لیکن کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ جامع مسجد کے میناروں سے مولانا ابوالکلام آزاد کی گھن گرج مسلمانوں نے سنی تھی۔ مولانا نے کہا تھا کہ:

"یہ دیکھو مسجد کے بلند مینار تم سے اچک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا؟ ابھی کل کی بات ہے کہ جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ تمہیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ دہلی تمہارے خون سے سینچی ہوئی ہے ....

...... میں کہتا ہوں کہ جو اجلے نقش و نگار تمہیں اس ہندوستان میں ماضی کی یاد کے طور پر نظر آ رہے ہیں۔ وہ تمہارا ہی قافلہ تھا۔ انھیں بھلاؤ نہیں، انھیں چھوڑو نہیں، ان کے وارث بن کر رہو، اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لئے تیار نہیں۔ تو پھر تمہیں کوئی طاقت نہیں بھگا سکتی۔ آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے ہم اس کے لئے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔

آج زلزلوں سے ڈرتے ہو، کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے۔ آج اندھیرے سے کانپتے ہو۔ کیا یاد نہیں کہ تمہارا وجود ایک اجالا تھا۔ یہ بادلوں نے میلا پانی برسایا ہے۔ تم نے بھیگ جانے کے خدشے سے اپنے پائنچے چڑھا لئے ہیں۔ وہ تمہارے ہی اسلاف تھے۔ جو

سمندروں میں اتر گئے۔ پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا، بجلیاں آئیں تو ان پر مسکرا دیئے۔ بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا، صرصر اٹھی تو اس کا رُخ پھیر دیا، آندھیاں آئیں تو ان سے کہا کہ یہ تمہارا راستہ نہیں ہے۔ یہ ایمان کی جان کنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے گریبانوں سے کھیلنے لگے، اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے کہ جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہیں تھا۔"

لیکن مولانا اس سے آگے نہ جا سکے، مطلع سے وہ بزرگ بھی غائب تھے۔ جو یہ کہا کرتے تھے پہلے انگریزوں کو بھگا لینے دو۔ بعد میں ہم اسلام اور اسلامی نظام کے لئے نقشۂ کار تیار کر لیں گے۔ اس مہیب اور گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اگر کسی کے اندر کچھ حرکت ہوتی اور کوئی کچھ کرنا چاہتا۔ تو کچھ ہلکے پھلکے دستوری حقوق اور کچھ قومی تحفظات کی بات سے آگے بالعموم پرواز نہیں ہوتی۔ اعلاء کلمۃ اللہ اور اسلامی نظام کے قیام کی بات کم از کم خلافِ مصلحت اور دیوانے کی بڑ سمجھی جاتی۔

ان حالات میں تحریک اسلامی کے بچے کھچے افراد اکٹھا ہوئے اور انھوں نے اعلان کیا کہ ؎

دین ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت ٭ ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا

انھوں نے نئے سرے سے اپنے آپ کو منظم کیا اور طے کیا کہ ہم اقامت دین کے لئے کام کرتے رہیں گے، اور اس سلسلے میں کوئی مصالحت نہ کریں گے۔ انھوں نے مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی کو اپنا میر کارواں منتخب کیا۔ ایک ایسے عہد میں جبکہ اسلامی نظام کی بات کرتے ہوئے دل بیٹھنے لگتے اور ہمتیں جواب دینے لگتی تھیں، مسلمانوں کے اس لٹے پٹے اور بچے کھچے قافلہ کی ناخدائی کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لینا پھولوں کی سیج یا بچوں کا کھیل نہیں، بڑے دل گردے کی بات تھی، صورت حال کچھ اس طرح تھی کہ ؎

"اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش"

باطل کی طرف سے تیر آنا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ لیکن اپنے ہی کیمپ اور اپنے ہی دوستوں کے تیروں سے دل و جگر چھلنی ہوئے جاتے تھے۔ ایک طرف ارباب حکومت، ہندو احیاء پرستی کے علمبردار اور دہریے صبر و ہمت کو آزما رہے تھے، دوسری جانب اپنے ہی بزرگ اور اپنے ہی علماء دعوت مبارزت دے رہے تھے، تیسری طرف مسلمانوں کے مخصوص ملی، معاشی، سیاسی اور تعلیمی مسائل تھے، چوتھی

طرف فرقہ وارانہ فسادات کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا۔ جس کا مسلمان شکار ہو رہے تھے وہ حالات جن میں یہ کاروانِ عشق و مستی آگے بڑھتا رہا اور اس کی کشتی کو کھیتا رہا، یہ مرد قلندر جسے ابواللیث کہئے یا شبیر محمد ؎

عشق بڑھتا ہی گیا دار و رسن زخم کھاتا ہوا مسکراتا ہوا ٭ راستہ روکتے روکتے تھک گئے زندگی کے بدلتے ہوئے زاویے

صبح آزادی کے بعد سے وفات سے چند ماہ قبل تک ——— بیچ میں ذرا انقطاع کے ساتھ ——— یہ مرد آہن ابواللیث اصلاحی تحریک اسلامی ہند کی قیادت کرتا رہا۔ مہیب موجیں اٹھتی رہیں طوفان حوادث سروں سے گذرتے رہے، طعن و تشنیع اور فتنوں سے لیکر جیل کی سلاخیں تک استقبال کرتی رہیں۔

اللہ کے فضل و کرم سے جماعت اسلامی ہند کے اندر جدید و قدیم دونوں میدانوں میں ایک سے ایک بڑھکر اصحاب فکر و تدبر افراد موجود رہے ہیں۔ اختلاف آراء یہاں بھی ہوتا رہا ہے جہاں پڑھے لکھے، صاحب رائے و تمیز اور عقل و شعور رکھنے والے دماغ موجود ہوں گے وہاں یہ ناگزیر ہے اور یہ کوئی نامناسب بات بھی نہیں، نامناسب تو اس کا حد اعتدال سے آگے بڑھنا اور فطری اور شرعی حدود و قیود سے تجاوز کرنا ہے۔ ان مختلف الآرا اور مختلف الخیال لوگوں کو ایک بار میں پروئے رکھنا، ایک مرکز سے باندھے رکھنا اور انہیں منتشر و پراگندہ اور بکھرنے نہ دینا، ایک دو دن نہیں، اتنے لمبے عرصے تک، یقیناً یہ بہت بڑا کارنامہ ہے اور اس کا سب سے بڑا کریڈٹ مولانا ابواللیث مرحوم کو جاتا ہے۔

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانہ میں ٭ فقط یہ بات کہ پیر مغاں ہے مرد خلیق

صحرائی خصوصیات رکھنے والا، اقبال کا یہ مرد مومن ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۵ اگست ۱۹۲۶ء کو مدرسۃ الاصلاح میں داخل ہوتا ہے۔ غالباً عربی چہارم کے بعد اسے ندوۃ العلماء جانے کا خیال آتا ہے اور وہ ندوہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ندوہ ہی میں اس کی معلمی کا آغاز ہوتا ہے۔ صحافتی میدان میں دنیا اس کی لیاقت و قابلیت کو اخبار "مدینہ" بجنور میں کچھ دنوں تک دیکھتی ہے۔ برار، آکولہ، مہاراشٹر بھی اس کی خدمات سے بہرہ مند ہوتا ہے، مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اعظم گڈھ میں اس کی معلمی دو ادوار پر محیط ہے پہلا دور ۱۹۳۲ء کے

اُس پاس کا ہے اور دوسرا دور سنہ ۱۹۴۶ء کے لگ بھگ کا ہے جب کہ آپ کو دوبارہ آگرہ، بہار شریف سے بطور خاص اصلاح بلایا گیا۔ اس موقع پر مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی کو "پٹھان کوٹ" اور مولانا ابوبکر صاحب اصلاحی کو "بستی" سے بلایا گیا تھا۔ اصلاح کی معلمی ہی کے زمانے میں سنہ ۱۹۴۸ء میں بحیثیت امیر جماعت انتخاب عمل میں آیا۔

مولانا مرحوم کوئی شعلہ بیان مقرر نہیں تھے۔ ٹھہر ٹھہر کر اور رک رک کر بولتے۔ بنیاد پر زور دیتے۔ نظم کی سختی سے پابندی کرتے اور کرواتے۔ انھیں اپنی طاقت کا خوب اندازہ تھا، انھوں نے غلط اندازہ کبھی نہیں لگایا، زندگی حالات پر گہری نظر رکھتے اور بروقت اور مناسب قدم اٹھاتے، نہ بزدلی کا شکار ہوتے نہ بے جا جوش کا مظاہرہ کرتے۔

ایک مضبوط اور پختہ سیرت کے مالک تھے۔ قرآن و حدیث میں ہمیں جو مرد مومن ملتا ہے، مولانا کی ذات میں وہ مرد مومن ہمیں نظر آسکتا ہے۔ اٹھتے، بیٹھتے، سوتے، جاگتے، آتے جاتے، ہر وقت خدا کو یاد کرنے والے، اس کی صفات کا شعور رکھنے اور زبان سے اس کا ذکر کرنے والے۔ وہ دعاؤں کا خاص اہتمام رکھتے۔ تسبیح اور اوراد و وظائف کے عادی تھے۔ سفر میں ہوں کہ حضر میں رات کے آخری حصہ میں ان کا مصلےٰ ہمیشہ آباد رہتا، نماز تہجد کے بعد ہاتھ اٹھا کر، دیر دیر تک لمبی لمبی دعائیں مانگتے۔ انتہائی محتاط تھے بے سوچے سمجھے زبان نہیں کھولتے، ایک ایک لفظ نہایت تول کر نکالتے، یہاں بے جا تبصروں، بے محل تنقیدوں اور غیبت کا دور دور تک امکان نہیں تھا۔ جیسے باہر انتہائی احتیاط برتتے ویسے ہی گھر میں، اور بالکل اپنے لوگوں کے درمیان بھی رہتے۔ گھر اور باہر میں اس پہلو سے کوئی فرق نہیں تھا۔ گھر اور باہر کی یہ یکسانی بغیر بدرجہ اتم تقویٰ اور خوف خدا کے نہیں ہو سکتی، وہ تقویٰ جو دل و دماغ کے ریشہ ریشہ میں سرایت کر چکا ہو، جو قلب و روح پر مستولی ہو۔ اور جس کے ہاتھ میں زندگی کی باگ ہو۔ اسی تقویٰ نے انھیں بے مثال سادگی پسند، قناعت پیشہ، غیر متشدد، خوددار، اخلاص و للہیت اور بے نفسی و منکسر المزاجی کا پیکر بنا دیا تھا۔ اخلاص کس چیز کا نام ہے؟ بے نفسی کسے کہتے ہیں، خودداری اور قناعت کی تعریف کیا ہے، یہ معلوم کرنا ہو تو ابو اللیث مرحوم کی زندگی بتائے گی کہ یہ ہے اخلاص، اسے کہتے ہیں للہیت اور بے نفسی، انکسار اور سادگی کا یہ مفہوم ہے۔ اسی بے مثال زہد و تقویٰ اور زندہ ایمان باللہ کا اثر تھا کہ اس نے انھیں ہر معنی میں خود

پر بہت زیادہ مضبوط اعصاب کا مالک بنا دیا تھا۔ ان کے قلب و جگر کو وہ غیر معمولی قوت و حوصلہ بخشا تھا کہ ایسے کتنے ہلا کر رکھ دینے والے لرزہ خیز حالات آئے اور آتے رہے کہ بڑے بڑے دل گردہ والے گھبرا اٹھیں لیکن یہ مولانا ہی کا جگر اور گردہ تھا کہ وہ ہلتے نہیں تھے، گھبراتے نہیں تھے، ان پر اثر نہیں ہوتا تھا اور ان کے حواس بحال رہتے[1]۔ اسی تقویٰ کی معجز نمائی تھی کہ ان کے اصولوں میں کبھی لچک نہیں پیدا ہوئی اور انھوں نے اپنے لیے جو شاہراہ حیات چن لی تھی اس پر تادم زیست چلتے رہے، نہ اپنوں کی محبت حائل ہوئی اور نہ غیروں کی دشمنی۔ یہ تقویٰ ہی تھا کہ زندگی کے پر پیچ اور طویل سفر میں نہ جھجکے، نہ ڈرے، نہ پست حوصلہ ہوئے، نہ ہمت ہاری اور نہ پشت پھیری، ہمیشہ مسلسل، بلا تکان، بغیر رکے، بغیر ستائے، بغیر دم لیے، راہ کے کانٹوں کو صاف کرتے، صعوبتوں کا مقابلہ کرتے اور باطل پر یلغار کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے اور پیش قدمی کرتے رہے۔ نہ ترہیبات زنجیر پا ثابت ہوئیں اور نہ ترغیبات راہ کا روڑا بن سکیں۔

یہ تقویٰ ہی تھا کہ مولانا کسی مخصوص خول میں بند نہیں ہوئے۔ تحزب اور گروہی عصبیت سے اوپر اٹھ کر دین اور اہل دین کے لیے خیر خواہ رہے۔ ہر مکتب فکر اور ہر مسلک خیال کے لوگوں سے ان کے گہرے اور ذاتی مراسم تھے۔ وہ ہر ایک کی خیر خواہی کرتے اور خوشی و غم میں شریک ہوتے۔ ملت میں ہونے والے واقعات پر تڑپ اٹھتے۔ ملک و ملت کے لیے جب کوئی مشکل وقت آپڑتا اور سخت معاملہ درپیش ہوتا تو ہم ہی نہیں، ملت کے افراد انتظار کرتے کہ مولانا ابو اللیث اصلاحی کا کیا موقف ہے۔ ان کا کیا اشارہ اور کیا بیان ہے۔ اس سے لوگوں کو روشنی ملتی، دین اور رجال دین سے اسی تعلق خاطر اور ذاتی نوعیت کے لگاؤ کا نتیجہ تھا کہ مولانا کی موت پر سب کی آنکھیں بھر آئیں۔ اپنے بھی روئے اور وہ بھی اپنے آنسوؤں کو روک نہ سکے جو ان سے فکر و نظر کا اختلاف رکھتے، اور جماعت کے کٹر مخالفین میں رہے ہیں۔

میں نے کسی کی موت پر اس طرح لوگوں کو روتے اور آنسو بہاتے نہیں دیکھا، ہچکیاں بندھ گئی تھیں، حالانکہ ان سے ان کا کیا تعلق تھا۔ نہ رشتہ دار تھے اور نہ ہی اس طرح کا کوئی

---

[1] مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی کی یہ گواہی ہے جو ان کے ساتھ لمبے عرصے تک رہے ہیں۔

تعلق تھا۔ یہ ہردلعزیزی اور محبوبیت کا مقام ان کی بے لوثی اور خیرخواہی کے علاوہ کس چیز کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔

مولانا مدرسہ کے فارغ تھے۔ مدارس کی ضرورت واہمیت اور ان کے رول پر ان سے بڑھ کر کون واقف ہوگا۔ وہ مدارس کو دین کا قلعہ سمجھتے تھے ان کا خیال تھا کہ ان ہی مدارس نے ہندوستان کو اسپین بننے سے بچا لیا ہے۔ یہ دین وملت کی آبیاری کے لئے تعلیمی اور بنیادی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ نئی نسل کی تیاری کا یہ کام، جسے آپ تصنیف رجال کہہ سکتے ہیں، دوسرے تمام کاموں سے بڑھ کر ہے۔ ان کی خواہش ہوتی کہ اساتذہ یکسو ہو کر یہ کام کریں کہ اقامت دین کے لئے بنیاد، غذا اور توانائی یہیں سے حاصل ہوگی۔

جامعۃ الفلاح مولانا کی آرزو اور ان کا خواب تھا۔ اول دن سے مولانا کو اس سے جو لگاؤ تھا، وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ مولانا یہاں کے ہونے والے اتار چڑھاؤ بلکہ بعض کی حرارتوں اور سانس کی گرمی اور اس کی آمد و شد سے بھی واقف رہنے کی کوشش کرتے۔ وہ اس کی مجلس انتظامیہ کے ممبر تھے اور تقریباً دس سال اس کے ناظم بھی رہے۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ مولانا جامعہ تشریف لائیں اور جامعۃ الفلاح کو رونق نہ بخشیں، اساتذہ وطلبہ بھی ان کا بے تابانہ انتظار کرتے۔

کہتے ہیں ہندوستان سونے کی چڑیا تھا، یہاں کی سرزمین سونا اگلتی تھی، انگریز سارا سونا اٹھا لے گئے۔ میں کہتا ہوں یقیناً یہاں کی سرزمین سونا اگلتی تھی اور اگلتی ہے، لیکن انگریز یا کوئی یہ طاقت نہیں رکھتا کہ اس کے سونے کو نگل سکے، یا ڈاکہ ڈال سکے۔ یہ سونا اپنی نوعیت کا مخصوص سونا ہے یہ نہ چرایا جا سکتا ہے، نہ چھینا جا سکتا ہے۔ مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ ہوں یا اسماعیل شہید اور احمد شہید، مولانا تھانوی، شبیر احمد عثمانی، مولانا مودودی اور اقبال، ان میں سے کون کس سونے سے کم ہے۔ اعظم گڈھ کی سرزمین تو اس معاملہ میں بڑی زرخیز ثابت ہوئی ہے یہ شبلی[1]، یہ فراہی[2]، یہ امین احسن[3]، یہ اختر احسن[4]، یہ جلیل احسن[5]، یہ صدر الدین[6]، یہ عبد الرحمن[7]، اور یہ ابواللیث اصلاحی

---

[1] مراد ہیں شبلی، شبلی نعمانی صاحب سیرۃ النبی، بندول اعظم گڈھ، شبلی قصبہ، جیراج پور اعظم گڈھ، شبلی اعظم گڈھ [2] علامہ حمید الدین فراہی صاحب تفسیر نظام القرآن پھریہا اعظم گڈھ [3] مولانا امین احسن اصلاحی صاحب تدبر قرآن، بمہور، اعظم گڈھ [4] مولانا اختر احسن اصلاحی سیدھا سلطان پور [5] مولانا جلیل احسن ندوی، سابق استاد جامعۃ الفلاح، اطری، اعظم گڈھ [6] مولانا صدر الدین اصلاحی پھولپور، اعظم گڈھ [7] مولانا عبد الرحمن صاحب تحفۃ الاحوذی، مبارک پور، اعظم گڈھ۔

ان میں کا ایک ایک آدمی اتنا وزنی اور اتنا قیمتی ہے کہ ترازو کے ایک پلڑے میں دنیا بھر کے سونے چاندی اور جواہرات رکھ دیئے جائیں اور دوسرے میں ان میں کا کوئی ایک فرد اپنی جوتی رکھ دے تو یہ پلڑا جھک جائے گا بلکہ ہیرے جواہرات سے ان کا مقابلہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ ملک اس معاملہ میں یقیناً بڑا خوش قسمت ہے ــــ "میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے" بالکل صحیح ہے۔ اگر لوگ اپنے ملکوں کی عظمت وبلندی اور شخصیات ورجال کا تذکرہ کریں کہ ہمارے یہاں یہ ہے وہ ہے تو ہم بے تکلف ابواللیث جیسے بے لوثوں کو پیش کر سکتے ہیں۔ اگر ہمارے پاس ایسے لعل و گہر موجود ہوں تو پھر کوئی غم نہیں اگر ہم بے تیغ بھی ہیں۔ ہم سنگلاخوں میں چشمہ جاری کر سکتے اور آسمانوں سے تارے توڑ کر لا سکتے ہیں۔ قوموں کی زندگی، مال و دولت کی فراوانی، اسباب و وسائل کی بہتات، کرسیوں اور عہدوں تک رسائی اور ڈگریوں اور ماسٹروں کے حصول کی مرہون منت نہیں ہوا کرتی۔ قوموں کی زندگی اور ان کی عظمت، جسمانی بھی، دینی و تہذیبی بھی، ان ہیروں سے وابستہ ہوتی ہے جو اپنے آپ کو دین وملت کے لئے قربان کرنا اور وقف کرنا جانتے ہوں جو شکست کی پرواہ نہ کریں جو اپنے کو گھلا دیں اور پگھلا دیں، جو اپنے آپ کو مٹا اور کھپا دیں۔ پھر کوئی قوم آنکھ نہیں دکھا سکتی، مقابلہ کی تاب لا نہیں سکتی، سائنسی و مادی ترقی اور ایٹمی توانائی سے مرعوب نہیں کر سکتی۔ ہم سے ہمارا لال قلعہ چھین سکتی ہے، ہمیں ہمارے قطب مینار اور تاج محل سے محروم کر سکتی ہے ہمیں کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ ہم ایک ابواللیث کیلئے دس لال قلعے قربان کر سکتے اور دس تاج محل کو پائے حقارت سے ٹھکرا سکتے ہیں۔ ہمیں کوئی غم نہیں، کوئی خطرہ نہیں۔

الٰہ العالمین مرحوم کی مغفرت فرما، ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ مولیٰ! انھوں نے دنیا کو بہت کچھ دیا اور دنیا سے بہت کم لیا۔ انھوں نے اپنے لئے کوئی مستقل گھر تک نہیں بنایا۔ حالانکہ اگر وہ چاہتے تو تیرے دیئے ہوئے دماغ اور تیری عطا کی ہوئی صلاحیت اور تیرے بخشے ہوئے وسائل سے کام لے کر بہت کچھ بنا سکتے تھے۔ مولیٰ! انہوں نے دین کی خاطر اپنے لئے کچھ نہیں کیا، انھوں نے دنیا سے اور دولت سے اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو بہت دور رکھا۔ خدایا! ان کے پاس بس کھپریل کا گھر تھا۔ اور وہ بھی بری طرح ٹپکتا تھا۔ آقا! انھیں اعلیٰ علیین میں جگہ دے، پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ ابھی ہمیں ان کی ضرورت تھی تو نے انھیں اپنے پاس بلا لیا۔ الٰہ العالمین! تو غیب سے ہمارے لئے سامان مہیا کر اور ان کا نعم البدل عطا فرما۔

مولانا مجیب اللہ ندوی

آہ...!
مولانا ابواللیث صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ

یہ دل گداز خبر اخباروں کے ذریعہ ناظرین ارشاد کو مل چکی ہوگی کہ ۷ ؍جمادی الاولی ۱۴۱۱ھ مطابق ۵ ؍دسمبر ۱۹۹۰ء کو دس بجے دن میں مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ سابق امیر جماعت اسلامی ہند کا انتقال ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝

۲ ؍دسمبر ۱۹۹۰ء کو اپنے وطن مالوف چاند پٹی میں مولانا پر دل کا دورہ پڑا مقامی ڈاکٹروں نے دوا علاج کیا مگر حالت بگڑتی ہی گئی۔ ۳ ؍دسمبر کو وہاں سے اعزہ و اقارب اعظم گڑھ شہر ڈاکٹر فرقان احمد جو مولانا کے قریبی عزیز ہیں ان کے گھر پر لائے انھوں نے اعظم گڑھ میں جو بہتر سے بہتر علاج ممکن تھا وہ کیا گلوکوز چڑھایا آکسیجن پہونچایا تو مولانا کی طبیعت قدرے سنبھل گئی۔ راقم الحروف کو ان کی بیماری کی اطلاع بارہ گھنٹہ بعد مولانا ابوالبقاء صاحب ندوی کے ذریعہ ملی انھوں نے بتایا کہ وہ تم کو یاد کر رہے تھے اتفاق سے کئی آدمی میرے یہاں بیٹھے ہوئے تھے ہم لوگ فوراً مولانا کی خدمت میں حاضر ہوگئے ہم لوگ پہونچے تو وہ غنودگی کے عالم میں تھے مگر جونہی میرا نام سنا فوراً فرمایا آؤ بھائی میں تمہیں کو یاد کر رہا تھا منع کرنے کے باوجود ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں ہم لوگوں نے محسوس کیا کہ انشاء اللہ مولانا صحت یاب ہو جائیں گے چلنے لگا تو انہوں نے دعا کیلئے کہا میں نے کہا انشاء اللہ ہم لوگ تہ دل سے دعا کریں گے ابھی ملت کو آپ کی ضرورت ہے خیال تھا کہ دوسرے دن پھر حاضر ہوں گے مگر اتفاق سے ایک سفر پیش آگیا وہ حاضر نہ ہوسکا۔ ۵ ؍تاریخ کو ۹½ بجے کے قریب ان سے ملاقات کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ برادرم عالم بدیع صاحب اور پھر

عزیزم عفران احمد گھبرائے ہوئے آئے اور بتایا کہ مولانا کی طبیعت کل زیادہ خراب ہوگئی تھی اس لئے ڈاکٹر فرقان نے گھر سے اپنے نرسنگ ہوم منتقل کر دیا تھا اور وہیں ابھی ابھی ان کا انتقال ہوگیا۔ ایک آہ! سرد نکلی اور اناللہ پڑھ کر ہم لوگ فرقان نرسنگ ہوم روانہ ہوگئے وہاں جا کر نعش پر پڑی چادر اٹھا کر چہرہ دیکھا تو بحمداللہ نور برس رہا تھا ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے سکون سے سو رہے ہوں۔

مولانا ابواللیث صاحب ندوی ۱۹۱۳ء میں موضع چاند پٹی میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی پھر مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں داخل ہوئے اور وہاں سے غالباً ۱۹۳۲ء میں فارغ ہوئے اور فراغت کے بعد ادب عربی کی تکمیل کے لئے ندوہ میں داخلہ لیا ندوہ میں اس وقت عالم عرب کے مشہور عالم اور ادب و نحو کے امام شیخ تقی الدین ہلالی آچکے تھے اور ندوہ میں ادب و انشاء کا ذوق در و دیوار سے ٹپک رہا تھا اس دور میں شیخ ہلالی کی صحبت میں جو ممتاز علماء پروان چڑھے اور دنیا میں عزت و شہرت حاصل کی ان میں مولانا عبدالرحمان کاشغری، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا محمد ناظم ندوی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا کوثر ندوی، مولانا ابواللیث ندوی مرحوم تھے۔ شیخ ہلالی کو مولانا سے بڑا انس تھا۔ چنانچہ مولانا کا نام ابواللیث انھیں کا رکھا ہوا ہے۔ ان کا گھریلو نام شیر محمد تھا مولانا ابواللیث صاحب کی علمی استعداد بھی ٹھوس تھی اور ادب و انشاء میں پوری قدرت تھی فراغت کے بعد مدرسۃ الاصلاح اور پھر کئی درسگاہوں میں درس و تدریس کی خدمت انجام دی جماعت اسلامی میں اس کے ابتدائے قیام ہی ۱۹۴۱ء سے شامل ہوگئے۔ پھر تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کی جماعت اسلامی کی امارت کی ذمہ داری ان کے کاندھوں پر آگئی جسے انتقال سے چند مہینے پہلے تک وہ پوری استقامت سے اٹھائے رہے۔

مولانا نے تقسیم ہند کے بعد جماعت اسلامی کی امارت کی ذمہ داری ۱۹۴۸ء کے بڑے پر آشوب دور میں سنبھالی اور جماعت کے منتشر کاموں اور افراد کی شیرازہ بندی کر کے پھر سے اسے نئی زندگی بخشی، اس وقت اس لٹے پٹے قافلہ کی سربراہی بڑے دل گردہ کی بات تھی خاص طور پر اس صورت حال میں جبکہ ایک طرف علماء کا ایک بڑا حلقہ اس کی مخالفت پر آمادہ تھا اور دوسری طرف حکومت اسے آر۔ ایس۔ ایس کی صف میں کھڑا کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اس سلسلہ میں ان کو

اور ان کے رفقاء کو تین بار جیل جانا پڑا ایک بار چار ماہ کے لئے دوسری بار ایک سال کے لئے اور تیسری بار تقریباً ۱۹ مہینے جیل میں رہے مگر انہوں نے اسے کبھی عزت و شہرت کا ذریعہ نہیں بنایا اور نہ بے تکلف مجلسوں کے علاوہ کبھی اس کا ذکر آنے دیتے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد جماعت اسلامی دو حصوں میں تقسیم ہوگئی، پاکستان اور ہندوستان کے حالات میں جو فرق تھا اس کے پیش نظر جماعت اسلامی ہند کے نظام میں انھوں نے اصولی اتفاق کے باوجود اس کی حکمت عملی جد وجہد اور نظام میں جو خوشگوار تبدیلی کی اس سے جماعت اسلامی ہند پاکستان کی جماعت اسلامی سے زیادہ اچھا کام کر سکی اس میں رفقائے کار کے مشوروں کے ساتھ مولانا کی ذاتی سوجھ بوجھ کو بھی بڑا دخل تھا۔

مولانا کا انتقال محض ایک عالم اور ایک جماعت کے امیر کا انتقال نہیں ہے بلکہ ان کے انتقال سے ملت اسلامیہ ہندیہ ایثار و قربانی، نیک نفسی اور نیک دلی، صبر و استقامت اور اعتدال پسندی اور سادگی و بے نفسی کے ایک زندہ نمونے سے محروم ہوگئی، ان خصوصیات میں وہ بالکل اسلاف کی یادگار تھے۔ ان کی زندگی میں زہد و اتقاء کے وہ مظاہر تو نہیں دکھائی دیتے تھے جو بہت سے لوگوں کا طرۂ امتیاز ہیں مگر وہ دنیادارانہ موٹے جھوٹے لباس میں سراپا زہد و اتقا تھے، وہ نماز باجماعت کے ساتھ نوافل، تہجد اور ذکر و اذکار کے بھی پابند تھے، ہندوستان کے اکثر مشائخ کی خدمت میں حاضری دینے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے، علماء کے طبقہ میں ان کے جیسے صفات کے لوگ اس وقت خال خال ملیں گے۔

وہ جس جماعت کے امیر تھے عرب ملکوں میں اسے کافی مقبولیت حاصل ہے اس کے ذریعے بے شمار لوگوں نے پورا مالی فائدہ حاصل کیا مگر انہوں نے اس کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اس دور میں شاید یہ مثال ڈھونڈنے سے ملے کہ ان کے لڑکے کو متحدہ عرب امارات کوئی جگہ مل گئی تھی مگر انھوں نے اس لئے نہیں جانے دیا بلکہ اسے کینسل کرا دیا کہ اس سے کوئی غلط مثال نہ قائم ہو۔ حالانکہ مولانا کو اس کی ضرورت تھی ان کی اور ان کے بال بچوں کی زندگی، گھر مکان کسی چیز سے یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ ان کے دل میں دنیا کی کوئی ہوس ہے، چکبندی میں بغیر کسی کوشش کے ان کے نام دوسروں کے کچھ کھیت آ گئے تھے جب علم ہوا تو انھوں نے ان نمبروں

بقیہ صفحہ ۱۴۲

عالم اسلام کا بطلِ جلیل

اگر تحریک اسلامی سے تعلق رکھنے والے افراد مولانا ابواللیث صاحب ندوی اصلاحی کو عالم اسلام کا بطل جلیل کہہ کر یاد کریں تو اسے شاید جماعتی جذبات سمجھا جائے گا لیکن اگر کوئی محقق مولانا کی پوری زندگی کا جائزہ لے کر دیکھے تو وہ بھی تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکے گا کہ مرحوم عالم اسلام کے بطل جلیل تھے ان کی پوری زندگی اسلام اور ملت اسلامیہ کی سرخروئی کی جد وجہد اور اعلیٰ انسانی اقدار کے فروغ کی کوششوں میں گذری یہ اور بات ہے کہ ایک مخصوص جماعت سے وابستگی کی بنا پر دیگر حلقوں نے ان کی وہ پذیرائی نہیں کی جس کی ان کی ذات مستحق تھی، اور واقعہ تو یہ ہے کہ جماعت اسلامی کی دوسری شخصیتوں کی طرح مولانا ابواللیث صاحب بھی ان باتوں سے بے نیاز، نام و نمود کی خواہش سے بہت دور اور شہرت والی محفلوں سے ہمیشہ گریز کرتے تھے مولانا مرحوم ملکی اور ملی مسائل پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے اور حسب ضرورت نہایت بھرپور طریقے سے اظہار خیال کرتے تھے، اکثر دیکھا گیا کہ عالم اسلام سے متعلق کسی مسئلہ میں مولانا نے جو رائے ظاہر کی ابتدا میں اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی لیکن بعد میں حالات نے ثابت کر دیا کہ مولانا کی رائے ہی درست اور جچی تلی تھی ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل بالخصوص ان کی دینی شناخت کے تحفظ کے سلسلے میں مولانا ابواللیث صاحب بہت فکرمند رہتے تھے۔ گذشتہ پانچ چھ سال کے عرصہ میں ان کی یہ فکر بہت بڑھ گئی تھی۔ تحریک اسلامی کے معاملہ میں اگرچہ مولانا کا دائرہ کار ہندوستان تھا اور وہ اپنے ملک ہی پر زیادہ توجہ دیتے تھے لیکن تحریک کے ایک ممتاز رہنما کی حیثیت سے آپ پوری دنیائے اسلام میں متعارف تھے۔

جماعت اسلامی ہند کی تاریخ تو مولانا ابواللیث صاحب کے تذکرے کے بغیر کبھی مکمل ہو ہی نہیں سکے گی، خواہ اس جماعت کو کام کرتے ہوئے کئی صدیاں گزر جائیں۔ تقسیم ہند کے بعد مولانا نے جماعت کی ذمہ داری اس وقت سنبھالی جب حالات نہایت نازک اور غیر یقینی تھے تقسیم ملک اور اس کے سلسلے میں ہونے والے فسادات کے صدمے سے مسلمان اپنے ہوش درست کرنے میں لگے ہوئے تھے اقامت دین کے کام کی طرف مسلمانوں کو کوئی خاص توجہ نہیں تھی۔ مولانا کی امارت کے پہلے ۲۴ سالہ دور میں جماعت

کئی بار سنگین مراحل سے گذری، پابندی اور قید و بند کا سلسلہ چلا لیکن مرحوم کی قیادت میں وابستگان جماعت نے نہایت استقلال اور ثابت قدمی کا ثبوت دیا۔ مولانا کی قیادت اور تربیت ہی کا نتیجہ ہے کہ آج جماعت اسلامی ہند اپنے مقصد کی طرف رواں دواں ہے۔ مرحوم کو اپنے رفقاء کار سے جو محبت تھی اور رفقاء جماعت اُن سے جو عقیدت و محبت رکھتے تھے اسے یا تو متعلقہ افراد جانتے ہیں یا پھر وہ مشاہدین جو مرکز جماعت میں اس چیز کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔

مولانا کی دینی بصیرت، تدبر و تفقہ اور قرآن و سنت کے علم کے بارے میں ان کے قدیم رفقاء جماعتی اور غیر جماعتی فہمیدہ لوگوں کی رائے ہے کہ اگر مولانا کو تنظیم کی قیادت نہ سونپی جاتی اور وہ یکسوئی کے ساتھ تصنیف و تالیف کا کام کرتے تو برصغیر کے علماء دین میں ایک ممتاز مقام کے حامل ہوتے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کی مغفرت فرما کر آخرت میں ان کے درجات بلند کرے۔

بقیہ جامعہ کے لیل و نہار

ڈاکٹر احسان احمد فلاحی کا انتقال برادر ڈاکٹر احسان احمد فلاحی ایک سال سے کچھ زائد عرصہ بیمار رہنے کے بعد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مرحوم نے تقریباً ایک سال تک بمبئی کے مختلف ڈاکٹروں کا علاج کیا۔ افاقہ نہیں ہو سکا، ایک ایمبولنس کے ذریعہ بمبئی سے اپنے وطن جامعہ سے متصل گاؤں ہنگائی پور لائے گئے، آنے کے تیسرے چوتھے دن آخری سفر پر روانہ ہو گئے۔ برادر ڈاکٹر احسان بڑی اچھی صحت کے مالک تھے لیکن مشیت ایزدی کے آگے انسان بے بس ہے۔ جامعۃ الفلاح سے فضیلت کے بعد مرحوم نے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ سے بی یو ایم ایس کیا تھا اور بلریا گنج میں مطب کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے اور مرحوم کو اپنی ردائے رحمت میں ڈھانپ لے۔

خالد حسن رشید فلاحی رو بصحت برادر خالد حسن رشید فلاحی اپنے وطن کلکتہ میں رمضان سے پہلے ایک سڑک حادثہ میں اس بری طرح زخمی ہو گئے تھے کہ اس کے بعد انسان کم ہی جانبر ہو پاتا ہے، لیکن اللہ کا فضل ہے کہ وہ آہستہ آہستہ رو بصحت ہو رہے ہیں۔ ان کے متعدد آپریشن ہوئے ہیں۔ ابھی بے انتہا کمزوری ہے پورے طور پر صحتیاب ہونے میں کئی سال لگیں گے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جلد شفائے کلی عطا فرمائے۔ قارئین سے بھی دعائے صحت کی درخواست ہے۔

محمد اسمٰعیل فلاحی

مولانا ابواللیث مرحوم کا اساتذۂ جامعہ سے ایک خطاب

مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی امیر جماعت اسلامی ہند، جامعہ کی انتظامیہ کے اجلاس میں شرکت کے لئے بلریا گنج تشریف لائے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اساتذہ کی خواہش پر جامعہ کے ذمہ داروں نے چائے کی نشست کا اہتمام کیا۔ مولانا ۲۰؍دسمبر ۱۹۸۸ء کو جامعہ کے ہال میں تشریف لائے۔ مولانا دن بدن کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک تو عمر کا تقاضا ہے دوسرے دن رات کی تحریکی مصروفیات نے نڈھال کر کے رکھ دیا ہے۔ چائے کے بعد صدر جامعہ مولانا عبدالحسیب صاحب اصلاحی کی درخواست پر امیر جماعت نے ایک مختصر لیکن نہایت پر اثر خطاب فرمایا۔ مولانا اپنی چھڑی کا سہارا لئے کرسی پر بیٹھے تھے اور اپنے مخصوص انداز میں ٹھہر ٹھہر کر گفتگو فرما رہے تھے۔ مولانا نے فرمایا "خود میری خواہش آپ سے ملاقات کی تھی لیکن کل جب کہ میری روانگی ہونے والی ہے، آج ایسا ممکن ہو سکا۔ میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے اس کے لئے وقت فارغ کیا؛"

مولانا کی گفتگو جاری تھی۔ مولانا کہہ رہے تھے، "ملک و ملت کو گوناگوں مسائل درپیش ہیں۔ مختلف ادارے کام کر رہے ہیں اور مختلف تحریکات سرگرم عمل ہیں۔ کسی کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سب اپنی اپنی جگہ ان مسائل کو حل کرنے اور مشکلات سے نمٹنے کے لئے قابل قدر کوششیں کر رہے ہیں لیکن جہاں تک دینی درسگاہوں کا تعلق ہے، واقعہ ہے کہ یہ درسگاہیں انتہائی گرانقدر خدمات انجام دے رہی ہیں، باطل کے سیلاب کے آگے ان کی حیثیت چٹان کی سی ہے اور ان کی مساعی سب سے زیادہ لائق تحسین، قابل قدر، نتیجہ خیز اور مفید ہیں۔" آپ نے حاضرین کی توجہ ملک کے حالات کی طرف مبذول کراتے ہوئے کہا، "اس وقت کیسی کیسی تحریکات آپ کے ملی تشخص کو ختم کرنے کے لئے سرگرم عمل ہیں اور ان کے اندوہناک اثرات مذہب و ملت پر مرتب ہو رہے ہیں۔ اگر ان کا بروقت تدارک نہ کیا گیا (آبدیدہ ہو کر) تو نہیں معلوم آئندہ نسلیں دین سے رشتہ قائم و باقی رکھ سکیں گی بھی یا نہیں۔ یہ ان درسگاہوں کا ہی فیض ہے کہ ملت

کا رشتہ دین سے باقی ہے اور آئندہ انہی سے امید بھی بندھتی ہے۔"

درمیان میں اسکولوں اور کالجوں کا بھی تذکرہ آیا اور مولانا نے ان کے قیام کو بھی ضروری قرار دیا اور کہا ان کے بھی فائدے ہیں اور مختلف میدانوں میں ان سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ہاں فائدہ کی نوعیت مختلف ہے لیکن دینی درس گاہیں اس ملک میں دین و ملت کی بقا کے لئے ایسی ہیں جیسے مضبوط و مستحکم قلعے۔

اگر یہ درس گاہیں آج نہ ہوتیں تو اس ملک میں بھی اس ملت کا وہی حشر ہوتا جو اسپین و قرطبہ میں ہو چکا ہے۔ ان درس گاہوں میں جامعۃ الفلاح کا ایک امتیازی مقام ہے۔ پہلے ہی دن سے اس کے اغراض و مقاصد میں ان سب باتوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے جو ضروری ہیں، جن سے ان فتنوں کا سد باب کیا جا سکے، حالات حاضرہ سے واقفیت ہو سکے اور فقہی اختلافات اپنی جائز حدوں کے اندر رہیں۔ آپ اتنے عظیم مقاصد کی حامل ایک بڑی درس گاہ کے اساتذہ ہیں۔ آپ کی کوشش ہونی چاہئے کہ یہاں ایسا ماحول ہو جس میں باہمی اعتماد، حسن ظن، محبت، بھائی چارہ اور ایثار و قربانی کی فضا ہو اور ایسا معاشرہ وجود میں آئے جس میں سب مل کر، قدم سے قدم ملا کر دین کی خدمت انجام دے سکیں۔ آپ کو اس پہلو سے ہمیشہ اپنا جائزہ لیتے رہنا چاہئے۔ رضائے الٰہی اور فوز آخرت، یہ وہ بنیادیں ہیں جن سے آپ کی نظر ایک لمحہ کے لئے بھی نہ ہٹے۔ آپ اپنے کاندھوں پر ایک عظیم خدمت کا بار اٹھائے ہوئے ہیں۔ آپ کے سپرد جو ذمہ داریاں ہیں، آپ کو دیکھتے رہنا چاہئے کہ ان میں کسی پہلو سے کوتاہی تو نہیں ہو رہی ہے۔ یاد رکھئے! آپ کی کوشش ہونی چاہئے کہ تعلقات خوشگوار ہوں، تلخیاں راہ نہ پائیں، اگر کبھی کوئی بات ہو بھی جائے تو پہلی فرصت میں ختم کرنے کی کوشش کیجئے، نگاہیں فرائض پر بھی رہیں اور فرائض ٹھیک طریقے سے ادا ہوں۔ یاد رکھئے! ملت کا مستقبل یہ طلبہ ہیں اور طلبہ کا مستقبل آپ سے وابستہ ہے۔ یہی کل ملت کے پاسبان بننے والے اور آپ کی جگہ لینے والے ہیں۔ اللہ ہم سب کو توفیق خیر دے کہ فرائض و ذمہ داریوں کا صحیح شعور پیدا ہو اور ان سے عہدہ برآ ہونے کا حوصلہ، ہمت اور طاقت بخشے۔"

تقریر ختم ہو چکی تھی۔ سوال و جواب کا سلسلہ تھا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ "بے نظیر زرداری کی جمہوریت کے مقابلے میں ضیاء الحق کی آمریت بہتر تھی"۔ راقم نے چاہا کہ اس سلسلہ میں مولانا

کا نقطہ نظر معلوم کرے لیکن پاکستان کا لفظ آتے ہی مولانا بول پڑے "ارے میاں جانے دو تمہارے اپنے مسائل کم ہیں کیا۔ آج بہت سارے مسائل اور ناخوشگواریوں کی جڑ یہی ہے کہ لوگ صرف دوسروں کو دیکھتے اور دوسروں کے مسائل میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اگر انسان اپنے اوپر نگاہ ڈالنے لگے اور اپنی ذمہ داریوں پر نظر رکھے تو بے شمار مسائل پیدا ہی نہ ہوں اور خواہ مخواہ کی غلط فہمیاں راہ نہ پائیں۔" سوال ادھورا ہی رہ گیا اور ایک صاحب نے ایک دوسرا سوال کیا۔

"مولانا کیا بات ہے سات آٹھ سال طلبہ ہمارے درمیان رہتے ہیں لیکن یہاں سے دوسرے اداروں میں جا کر وہاں کا اثر بہت جلد قبول کر لیتے ہیں اور اپنی خو، بو بھول جاتے ہیں؟"

امیر جماعت نے جواب دیا۔ "آپ کو غور کرنا چاہئے کہ آپ کی تعلیم و تربیت میں کوئی نقص تو نہیں رہ گیا ہے کہ طلبا جا کر غلط ماحول کا وہ مقابلہ نہیں کر سکے۔ لیکن یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ آپ کی طرف سے لازماً کوتاہی ہوئی ہو۔ اس کا بھی امکان ہے کہ آپ نے تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ہو اور آپ کی کوششیں ٹھیک رخ پر رہی ہوں لیکن پھر بھی وہاں جا کر اثرات قبول کر لیں۔ ہر صورت میں بگاڑ کی ذمہ داری آپ اساتذہ پر ہی نہیں ہے۔ پھر بھی آپ کو دیکھنا چاہئے کہ شاید تربیت میں کوئی کمی تو نہیں۔"

سائل کو مخاطب کرتے ہوئے آپ نے کہا: "بحیثیت مجموعی آپ کی بات صحیح نہیں ہے جہاں تک جامعۃ الفلاح کا تعلق ہے تو میرا اپنا تاثر یہ ہے کہ جامعہ کے طلبہ دیگر درس گاہوں کے مقابلے میں اس درجہ متاثر نہیں ہوتے ہیں جتنا دیگر درس گاہوں کے طلبہ متاثر ہوتے ہیں۔ آپ کا کام یہ ہے کہ جو طلبہ فارغ ہو رہے ہیں ان سے بے تعلق نہ ہوں، ان سے ربط رکھیں۔"

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کی طرف، جو اس سلسلہ میں کافی فعال ہے اور فارغین سے مسلسل ربط رکھنے کی کوشش کر رہی ہے، اشارہ کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ "اسی مقصد کے لئے آپ کے فارغین کی ایک تنظیم ہے جو اس سلسلہ میں کام کر رہی ہے۔ اور بھی بعض طلبہ تنظیمیں اس سلسلہ میں کام کرتی رہتی ہیں۔ ایس۔ آئی۔ ایم بھی کام کر رہی ہے لیکن جماعت نے کام کی وسعت اور ہمہ گیری کی بنا پر اس کو ناکافی سمجھ کر ایس۔ آئی۔ او قائم کی جو اس

سلسلہ میں پیش رفت کر رہی ہے۔ ایک تو طلبہ کا شعور پختہ نہیں ہوتا دوسرے غیر مسلم تو غیر مسلم، مسلمانوں پر بھی مادیت پرستی کا زبردست غلبہ ہے۔ باہر جانے کی راہوں کے کھل جانے کے نتیجے میں اس میں اور اضافہ بھی ہو گیا ہے اس لئے مسلسل نگہداشت اور ربط کی ضرورت ہے لیکن مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ دینی تعلیم بے اثر نہیں ہو سکتی۔ وقتی طور پر طلبہ متاثر ہو سکتے ہیں لیکن دیر سویر دینی تعلیم اپنا رنگ دکھائے گی اور اس کا اثر ضرور ہوگا آپ لوگوں کو مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ایک نوجوان نے بالکل آخری مرحلہ میں بابری مسجد رابطہ کمیٹی کے دو دھڑوں میں بٹ جانے کا تذکرہ کیا اور مولانا کے خیالات معلوم کرنے چاہے۔ مولانا نے افسوس کے ساتھ فرمایا "یہ بد قسمتی کی بات ہے۔ دعا کرو مسلمانوں کے اختلافات ختم ہو سکیں۔"

اور بھی بعض سوالات کئے گئے جن کا جواب مولانا نے دیا۔ آخر میں صدر جامعہ نے محترم امیر جماعت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "مولانا نے جن قیمتی مشوروں سے نوازا ہے اور جو گراں قدر نصیحتیں فرمائی ہیں ہم مولانا ہی سے درخواست کرتے ہیں کہ مولانا دعا کریں کہ ہم ان پر عمل پیرا ہو سکیں تاکہ جن مقاصد کے تحت یہ درس گاہ قائم ہوئی ہے وہ پورے ہوں اور یہ درس گاہ دین و ملت کے لئے بیش از بیش خدمت انجام دے سکے۔"

طلبہ کی شدید خواہش تھی کہ محترم امیر جماعت ان کے لئے بھی وقت نکالیں لیکن وقت کی کمی اور صحت کی کمزوری حائل رہی اور یہ ممکن نہ ہو سکا۔ (بحوالہ حیات نو جنوری ۱۹۹۰ء)

(بقیہ مولانا ابواللیث سے لیا گیا انٹرویو)

جو خدا اور اس کے رسول کے خلاف ہو۔ باقی رہا اصل تصوف جسے احسان کہا جاتا ہے اس کا ہم میں سے کوئی بھی منکر نہیں بلکہ انتہائی ضروری سمجھتا ہے۔

بحوالہ غریب کا نور

مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی سے لیا گیا ایک

انٹرویو

مولانا کا مندرجہ ذیل انٹرویو نایاب ہے۔ مولانا نے مختصراً تمام ہی پیچیدہ سوالات کے جوابات دے دیئے ہیں۔ اسے افادۂ عام کیلئے قند مکرر سمجھا جائے

ادارہ

س۔ کیا مولانا مودودیؒ نے کوئی مذہب ایجاد کیا ہے؟

ج۔ ہرگز نہیں، بلکہ وہ تو اس مذہب (اسلام) کی پیروی اور تبلیغ کر رہے ہیں جسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خداوند کریم کی طرف سے دنیا میں پھیلایا۔

س۔ کیا جماعت اسلامی کا رکن بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مولانا مودودیؒ کی ہر رائے کو مانا جائے؟

ج۔ ہرگز نہیں، اس لئے کہ مولانا مودودی صاحب معصوم نہیں ہیں ان سے بھول چوک ہو سکتی ہے چنانچہ خود جماعت میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ان کی متعدد ذاتی رایوں سے جن کا اصلاً دعوت سے کوئی تعلق نہیں ہے اختلاف رکھتے ہیں۔ خود مولانا مودودیؒ صاحب نے کھول کر لکھ دیا ہے کہ جماعت کا رکن بننے کیلئے ان کی ہر بات کا ماننا ضروری نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو روداد حصہ اول صفحہ ۱۸-۹

س۔ کیا آپ ان مسلمانوں کو مسلمان نہیں سمجھتے جو جماعت میں داخل نہیں ہیں؟

ج۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ، خدا نہ کرے کہ ہم ایسا برا عقیدہ رکھیں چنانچہ جماعت

کے دستور میں اس کو ظاہر بھی کر دیا گیا۔

س ۔ کیا مولانا مودودی صاحب نبی ؑ یا مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کر چکے ہیں یا کرنے والے ہیں؟

ج ۔ مولانا مودودی صاحب نے ابھی تک اس طرح کا کوئی دعویٰ نہیں کیا ہے اور ان کی سمجھ بوجھ سے یہ اندیشہ نہیں ہے کہ وہ ایسی نادانی کا کام کریں گے لیکن خدانہ کرے انہوں نے ہماری زندگی میں ایسی غلطی کی تو دوسرے مسلمانوں کی طرح ہم بھی ان کے اس دعویٰ کو نہ مانیں گے۔ اور پوری قوت سے اس کی مخالفت کریں گے۔

س ۔ کیا بقول علماء معترضین خارجیوں کی طرح آپ بھی عمل کو ایمان کا جزو مانتے ہیں؟

ج ۔ جماعت اسلامی کے ارکان میں حنفی بھی ہیں اور غیر حنفی بھی یعنی شافعی، اہلحدیث بھی، ان میں جو امام ابو حنیفہ کے ماننے والے ہیں وہ عمل کو ایمان کا جز نہیں سمجھتے چونکہ امام مالکؒ امام شافعیؒ امام حنبلؒ امام بخاریؒ امام مسلمؒ اور دوسرے محدثین کرام اور شیخ عبدالقادر رحمہم اللہ علیہم جیسے علماء امت عمل کو ایمان کا جزو قرار دیتے ہیں اس لئے ہم اس عقیدے کے لوگوں کو سچا مسلمان جانتے ہیں جن راسخ العقیدہ اہل علم نے ہمارے خلاف فتوے دیتے ہوئے عمل کو ایمان کا جزو قرار دینا صرف خارجیوں اور معتزلیوں کا عقیدہ لکھا ہے۔ انہوں نے علماء امت کی سخت توہین کی ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس کوتاہی کو معاف فرمائے۔ دراصل خارجیوں کا مخصوص عقیدہ یہ ہے کہ گناہ کبیرہ سے انسان کافر ہو جاتا ہے یہ عقیدہ اہل سنت و "الجماعت" کے خلاف ہے خدا اس بُرے عقیدے سے سب مسلمانوں کو بچائے۔

س ۔ کیا آپ اپنی جماعت کو مسلمانوں سے الگ کوئی فرقہ قرار دیتے ہیں؟

ج ۔ ہرگز نہیں ہم نے کبھی ایسا خیال نہیں کیا لیکن ہمارے مخالفوں کی یہ خواہش ضرور ہے کہ وہ ہمیں عام مسلمانوں سے جدا کریں۔ جہاں تک ہماری کوشش کا تعلق ہے انشاء اللہ ہم ایسا ہرگز نہ ہونے دیں گے۔

س ۔ کیا آپ عام مسلمانوں کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ یا حرام سمجھتے ہیں؟

ج ۔ ہرگز نہیں بلکہ ہم کو جب کبھی اتفاق ہوتا ہے ان حضرات کے پیچھے بھی نماز پڑھنے سے گریز نہیں کرتے جو ہمیں گمراہ بتاتے اور ہمارے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ قرار دیتے ہیں۔

س ۔ کیا آپ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی خلافت راشدہ کو نہیں مانتے اور ان کی ذات گرامی کو اسلام کی بربادی کا سبب بتاتے ہیں؟

ج ۔ **استغفراللہ**، بلکہ ہم تو کسی صاحب عقل مسلمان سے توقع ہی نہیں رکھتے کہ وہ حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ کو رسول کا سچا خلیفہ نہ مانے گا۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ جو شخص اپنے اسلام میں فتنہ و فساد پھیلانے والا یا باعث بنے وہ سنی نہیں خارجی ہے ان کی ذات گرامی سے اسلام کو بڑے بڑے فائدے پہنچے ہیں جن کا صحیح حدیثوں میں ذکر موجود ہے اگر ہماری کسی عبارت سے کوئی شخص کچھ اور مطلب نکالے گا تو ہم اس کی ذمہ داری سے عنداللہ بری ہوں گے۔

س ۔ کیا آپ صحابہ کرام اور دوسرے بزرگان دین کی توہین کرتے ہیں اور ان کی اسلامی خدمات کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے؟

ج ۔ خداوند عالم ہمیں اور تمام مسلمانوں کو اس خباثت سے محفوظ رکھے، نہ ہم صحابہؓ اور دوسرے بزرگان دین کی توہین کرتے ہیں اور نہ ان کی اسلامی خدمات کو بری نظر سے دیکھتے ہیں بلکہ ہمارا تو یہ عقیدہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی تعلیم ان بزرگوں نے ہی ہم تک پہنچائی ہے۔ اور ان ہی کی پیروی تمام مسلمانوں کے لئے باعث سعادت ہے

س ۔ کیا آپ تصوف کو نہیں مانتے اور اسے بدعت، یوگ اور رہبانیت قرار دیتے ہیں؟

ج ۔ تصوف کے بارے میں پوری جماعت کا کوئی عقیدہ یا خیال نہیں ہے ہماری جماعت میں ایسے ارکان بھی شامل ہیں جو کسی بزرگ کے مرید ہیں اور ایسے بھی جو پیری مریدی کے قائل نہیں ہاں اس پر سب کا اتفاق ہے کہ تصوف کے نام سے کسی ایسی بات کو تسلیم نہ کیا جائے

بقیہ صفحہ ۱۴۰ پر

جامعہ کے لیل و نہار

محمد اسمٰعیل فلاحی

انتظامیہ کا اجلاس اور بعض اہم تبدیلیاں

عید الفطر کے بعد انتظامیہ کا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں جامعہ کے نائب ناظم جناب حاجی عبدالمتین صاحب نے اپنی خرابی صحت کی بنا پر استعفا دیا وہ منظور ہوا اور جناب مولانا ابوالبقا ندوی صاحب کو نائب ناظم منتخب کیا گیا۔ نیز جناب مولانا ابوبکر صاحب اصلاحی نے اپنی خرابی صحت کی وجہ سے رمضان سے قبل صدارت سے استعفا دے دیا تھا، مجلس عاملہ نے موصوف کے عذر کو معقول سمجھتے ہوئے ان کا استعفا منظور کیا اور مولانا نظام الدین صاحب اصلاحی (سابق امیر حلقہ جماعت اسلامی ہند گجرات) کو صدر جامعہ منتخب کیا، اسی طرح مولانا رحمت اللہ الاثری فلاحی صاحب کا استعفا بھی منظور کر کے مولانا محمد طاہر صاحب عمری کو نگران اعلیٰ مقرر کیا۔

جہاں ہم ان نو منتخب حضرات کے لئے نیک تمنائیں رکھتے اور اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ انھیں ان کی مفوضہ ذمہ داریاں بحسن وخوبی انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے وہیں سابق نائب ناظم جناب حاجی عبدالمتین صاحب، سابق صدر مدرس جناب مولانا ابوبکر صاحب اصلاحی اور سابق نگران اعلیٰ جناب مولانا رحمت اللہ الاثری فلاحی کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں جو پر آشوب اور بحرانی دور میں جامعہ کو حاصل ہوئیں۔

انجمن کی شوریٰ کا اجلاس

انتظامیہ کے اجلاس کے معاً بعد انجمن طلبہ قدیم کی شوریٰ کا اجلاس ہوا۔ اجلاس میں صدر انجمن اور سکریٹری انجمن شریک نہیں ہو سکے۔ کورم پورا نہ ہونے کی بنا پر اجلاس کی غیر رسمی کارروائی قائم مقام سکریٹری مولانا رحمت اللہ الاثری فلاحی صاحب کی زیر صدارت ہوئی، مختلف امور زیر بحث آئے، حیات نو جن مسائل سے دوچار ہے، ان پر تفصیلی گفتگو رہی اور یہ طے ہوا کہ عارضی طور پر اس کے صفحات کو کم کر کے ۴۸ صفحات کر دیئے جائیں۔

معتمدین جمعیۃ الطلبہ کا انتخاب

طلبہ جامعہ کو زیور علم سے آراستہ کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں عملی تربیت کے مواقع بہم پہونچانے کے

لئے ان کی ایک جمعیت جمعیۃ الطلبہ ہے۔ اس کے تحت متعدد شعبے ہیں۔ ایک سال کیلئے ان کا انتخاب ہوتا ہے۔ طلبہ اپنے میں سے بہتر شخص کا انتخاب کرتے ہیں۔ ابھی ابھی جمعیت کا انتخاب مکمل ہوا ہے اور سرپرست جمعیت مولانا محمد سلامت اللہ صاحب اصلاحی کی موجودگی میں سابق سکریٹری جمعیت جاوید سلطان سلمہٗ نے نو منتخب سکریٹری شمشاد حسین بجنوری کو جمعیت کا چارج دے دیا ہے۔ نئے معتمدین کی فہرست حسب ذیل ہے۔

۱۔ سکریٹری جمعیۃ الطلبہ	شمشاد حسین بجنوری
۲۔ لائبریرین	تنویر عالم دہلوی
۳۔ معتمد مطبخ	شاہ نواز احمد اعظمی
۴۔ معتمد رسائل و جرائد	اظہر الدین بستوی
۵۔ معتمد خطابت و صحافت انگریزی	حیدر علی نیپالی
۶۔ معتمد خطابت و صحافت عربی	نسیم احسن سمستی پوری
۷۔ معتمد خطابت و صحافت اردو	عارف حسین نیپالی
۸۔ معتمد کھیل	محمد الیاس نیپالی
۹۔ معتمد اسٹور	اسعد علی بجے پوری
۱۰۔ معتمد باغبانی و آب رسانی	سراج احمد گونڈوی
۱۱۔ معتمد خدمت خلق	عبید الرحمان
۱۲۔ معتمد روشنی و صفائی ولاؤڈ اسپیکر مسجد	نذیر احمد کشمیری

معتمد خطابت و صحافت اردو	عربی پنجم	ابو صالح اعظمی
" " " " "	چہارم	سراج الدین بستوی
" " " " "	سوم	الیاس احمد گونڈوی
" " " " "	دوم	کفیل الرحمان
" " " " "	اول	سرتاج عالم
" " " عربی	عربی اول تا چہارم	عبدالعلیم بستوی
" " " انگریزی " " "		سید ابوبکر صدیق حیدرآبادی

—— محمد عنایت اللہ سبحانی

سارا چمن اداس ھے مالی کہاں گیا

صدیق مکرم جناب مولانا عبد المجید ندوی کی یاد میں

مولانا عبد المجید ندوی مرحوم حضرت مولانا ابو اللیث صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خاص ارادت مندوں میں تھے ۔ وہ تحریک اسلامی کے ایک جاں باز سپاہی تھے ۔ وہ مدرسۃ الاصلاح ، سرائے میر کے صدر مدرس اور مولانا علیہ الرحمہ کی بہت سی توقعات کا مرکز تھے ۔ لہٰذا ضروری تھا کہ یہ خاص نمبر مولانا ندوی کے حادثۂ جاں کاہ کے تذکرے سے خالی نہ ہو ۔ ادارہ حیات نو مولانا ندوی کے اس حادثے پر شدید رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور مولانا سبحانی کے احساسات کو اپنے دل کی آواز سمجھتا ہے ۔

—— ادارہ ——

آہ ، ۲۳ مئی سنہ ۹۱ء کا دن بھی کیسا دن تھا ، کہ ہم اس کا تقریباً ایک ماہ سے انتظار کر رہے تھے ۔ مگر وہ آیا تو ہمارے لئے خوشیوں کے بجائے غموں کے قافلے ساتھ لایا !

ہم اس دن کا انتظار کر رہے تھے کیونکہ یہی دن عزیزی ایوب سلمہ کے عقد نکاح کا دن طے پایا تھا ۔

ہم اس دن کا انتظار کر رہے تھے اور خوش تھے کہ اس روز نہ صرف عزیزی ایوب سلمہ کا عقد نکاح ہوگا ، بلکہ بہت سے مخلص دوستوں اور مشفق بزرگوں سے ملاقات کا لطف بھی حاصل ہوگا ، خاص طور سے جس مخلص دوست اور مشفق بزرگ سے ملاقات کی آرزو تھی ، وہ مولانا عبد المجید صاحب مرحوم تھے ، آہ ! وہ مولانا عبد المجید صاحب ، جنہیں آج مرحوم لکھتے ہوئے

کلیجہ کانپ رہا ہے اور قلم لرز رہا ہے !

آہ ! ۲۳ مئی کی ہی رات میں مولانا مرحوم ہمیں خواب میں نظر آئے تھے ، بہت ہی ہنستے اور مسکراتے ہوئے ۔ ہم نے اس خواب کا مطلب یہ سمجھا تھا کہ یہ ایک اطمینان دہانی ہے اس بات کی کہ میں آرہا ہوں تم سے ملاقات کے لئے ۔

آہ ! کسے معلوم تھا کہ یہ ملاقات کی اطمینان دہانی نہیں ہے بلکہ یہ آخری سفر پر روانہ ہونے سے پہلے کا آخری سلام ہے !

آہ ! اس جانے والے بزرگ دوست نے اس دنیا سے جاتے جاتے بھی دوستی و محبت کا حق ادا کر دیا ۔

آہ ! ایسی پرخلوص دوستیاں کہاں نصیب ہوتی ہیں اس زمانے میں ۔

آہ ! وہ بے رحم وحشی جس نے مولانا علیہ الرحمہ پر اس وقت قاتلانہ حملہ کیا ، جب کہ وہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر سے چل کر موضع علاؤ الدین پٹی جا رہے تھے عزیزی ایوب سلمہ کے عقد نکاح میں شرکت کے لئے ۔

آہ ! اس بے رحم وحشی نے مولانا پر حملہ کرتے ہوئے یہ نہ سوچا کہ وہ اپنے جیسے کسی وحشی پر حملہ نہیں کر رہا ہے ، بلکہ وہ اس نیک سرشت اور شریف النفس انسان پر حملہ کر رہا ہے جو ہزاروں ہزار انسانوں میں کا ایک ہے ۔ اور اس پر حملہ کر کے وہ کسی ایک آدمی کا خون نہیں کر رہا ہے بلکہ درحقیقت وہ نیکی و شرافت کا خون کر رہا ہے ۔ اور انسانیت کی قبا چاک کر رہا ہے ۔

آہ ! مولانا مرحوم کتنے قیمتی انسان تھے ! اور کتنی گوناگوں خوبیوں کے مالک تھے ۔

وہ انتہائی مخلص اور بے لوث انسان تھے ، ان کے اخلاص اور بے لوثی کا ہی نتیجہ تھا ، کہ ان کی سخت گیریوں کے باوجود کبھی ان کی نیت پر شبہ نہیں ہوتا تھا ۔ بلکہ انہیں جاننے والا ان کی سخت گیریوں میں ایک لذت محسوس کرتا اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کے اخلاص و بے لوثی کا معترف ہوتا جاتا ، ان کے اخلاص و بے لوثی کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ جو ان کا جتنا ہی قریبی ہوتا اتنا ہی زیادہ ان کی سخت گیریوں سے دوچار ہوتا ، یہی وجہ ہے کہ

ان کی سخت گیری ان کے اخلاص و محبت کی ایک علامت بن گئی تھی۔ اور طلبہ ہی یا اساتذہ یا ان کے دوست احباب سب لوگ ان پر مکمل اعتماد کرتے۔

وہ بڑی وجیہ اور بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے سرکش ان کے سامنے اپنی سرکشی بھول جاتے۔ ان کے علاقے میں جب بھی جھگڑے اور اختلافات ہوتے، تو عموماً ان کا وہاں پہنچ جانا ہی ان جھگڑوں کے ختم ہو جانے اور ان اختلافات کے دور ہو جانے کے لئے کافی ہوتا۔

خود مدرسۃ الاصلاح کے اندر کئی بار طلبہ کی اسٹرائک ہوئی۔ اور حالات ذمہ داروں کے قابو سے باہر ہو گئے۔ ان نازک حالات میں مدرسہ کو جس نے سنبھالا، اور شماتت اعداء سے جس نے اسے محفوظ رکھا، وہ انہیں کی وجیہ اور بارعب شخصیت تھی۔ مدرسہ کو سنبھالنے، اور انتہائی نازک ترین اوقات میں اس کی شیرازہ بندی کرنے میں مولانا مرحوم کا جو ہاتھ رہا ہے، وہ خاص ان کا حصہ ہے۔ وہ اپنے حسن نظم و انتظام اور اپنے حسن کارکردگی کے نتیجہ میں مدرسہ کی تاریخ کا ایک اہم باب بن چکے ہیں۔ اور جب بھی اس مدرسہ کی تاریخ لکھی جائے گی، یہاں کی تاریخ ساز شخصیتوں میں ان کا نام نہایت جلی حروف میں لکھا جائے گا۔

ان کی اس وجیہ اور بارعب شخصیت کا فیض مدرسۃ الاصلاح یا اس کے مضافات تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ اس حیثیت سے وہ دور دور تک معروف تھے۔ چنانچہ شخصی طور پر مجھے معلوم ہے کہ ایک بار شعبۂ تصنیف و تالیف علی گڑھ کے کچھ پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کے لئے شعبہ کے جنرل سکریٹری مولانا جلال الدین انصر عمری صاحب نے اپنے نجی تعلقات کی بنیاد پر انہیں وہاں آنے کی دعوت دی تھی چنانچہ ان کی دعوت پر وہ علی گڑھ تشریف لے گئے، اور جن مسائل کی وجہ سے مولانا انصر صاحب مدتوں سے پریشان تھے، وہ مولانا مرحوم کے وہاں پہنچتے ہی حل ہو گئے۔

اسی طرح ادارہ علوم القرآن علی گڑھ کے کچھ الجھے ہوئے مسائل کو حل کرنے کے لئے ناظم ادارہ جناب ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی کی دعوت پر ایک بار پھر وہ علی گڑھ تشریف

لے گئے۔ اور وہ مسائل بھی ان کے وہاں پہنچتے ہی حل ہو گئے۔

وہ اپنی فراست و بصیرت اور معاملہ فہمی کے لحاظ سے بھی اپنے علاقہ میں معروف تھے۔ ان کا ناخن تدبیر وہ گرہیں بڑی آسانی سے کھول لیا کرتا، جن گرہوں کو کھولنے سے اچھے اچھے لوگ عاجز رہ جاتے۔ اسی لئے بہت سارے لوگ اپنے مسائل ان کے پاس لاتے۔ اور نہایت خوش اور مطمئن ہو کر وہاں سے واپس جاتے، وہ بڑی ہی بلند اور خوددار طبیعت کے مالک تھے۔ کوئی ایسا کام جو خودداری کے خلاف ہو اس کا ان کے یہاں کوئی گزر نہ تھا۔ وہ نہ صرف یہ کہ خود اس طرح کے کاموں سے دور رہتے، بلکہ دوسروں کے لئے بھی اسے سخت ناپسند فرماتے۔ چنانچہ ایک بار مدرسہ کے اساتذہ نے تنخواہوں میں اضافہ کے لئے درخواست دینی چاہی تو انہوں نے پسند نہیں فرمایا، انہوں نے کہا کیا ذمہ داران مدرسہ اناج نہیں کھاتے ہیں کہ انہیں ان باتوں کی طرف توجہ دلائی جائے۔ یہ چیزیں تو خود ان کے محسوس کرنے کی ہیں، ہمارے محسوس کرانے کی نہیں۔

وہ ہمارے نہایت دیرینہ دوست تھے۔ ان سے برسہا برس کے تعلقات تھے۔ لیکن ہم نے کبھی انہیں کوئی ایسا کام کرتے ہوئے نہیں پایا، جو بلندی و خودداری کے خلاف ہو۔

وہ جرأت و شجاعت کے پیکر تھے۔ حق گوئی و بے باکی ان کا خاص وصف تھا۔ وہ کبھی حق کے معاملے میں کسی مداہنت کے روادار نہ ہوتے۔ ایک بات کو حق سمجھتے تو برملا اس کا اعلان کرتے، چاہے ان کا ساتھ دینے والا کوئی نہ ہو۔ اور چاہے اسکے لئے انہیں کتنی ہی بڑی قربانی پیش کرنی پڑے۔

اس جرأت و شجاعت کے ساتھ ساتھ ان کے اندر بلا کا ضبط و تحمل تھا۔ وہ جذبات کے مغلوب نہ ہوتے۔ خواہ کتنا ہی اشتعال انگیز موقع ہو، ان کے اعصاب متاثر نہ ہوتے۔ وہ نہایت مضبوط اعصاب کے ساتھ حالات کا سامنا کرتے۔ اور کبھی آپے سے باہر نہ ہوتے۔ اور جلد بازی میں کوئی قدم نہ اٹھاتے عموماً وہ جو فیصلہ کرتے بہت ہی ٹھنڈے دل و دماغ سے کرتے۔ اور تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کے کرتے۔ اسی لئے عموماً انکے فیصلوں میں بڑا توازن ہو-

فیصلہ کر چکنے کے بعد انھیں شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

وہ اپنے اصولوں میں سخت تھے۔ اصولوں کے معاملے میں کسی رواداری کے قائل نہ تھے۔ جو اصول طے کر لیتے، اس پر مضبوطی سے قائم رہتے۔ وہ سفارشوں کے دباؤ میں آکر کبھی اصولوں میں لچک پیدا کرنے کے لئے تیار نہ ہوتے۔ خواہ وہ سفارش کرنے والا کوئی بھی ہو، اور کسی بھی درجہ کا آدمی ہو۔ ابھی چند روز پہلے کی بات ہے، راقم الحروف نے ایک ایسے بچے کے داخلہ کے لئے ان کے ہاں سفارشی خط لکھا، جو گزشتہ سال جامعۃ الفلاح کا طالب علم رہ چکا تھا، مگر امسال کسی وجہ سے اس کے داخلہ کی تجدید نہیں ہو سکی تھی۔ بچہ چونکہ بہت ذہین تھا اور خطرہ تھا کہ کہیں اس کی یہ ذہانت ضائع نہ ہو جائے۔ اسی لئے عاجز نے مولانا علیہ الرحمۃ سے، جو مدرسۃ الاصلاح کے صدر مدرس تھے، یہ گزارش کی تھی کہ وہ اسے اپنے یہاں رکھ لیں۔ اس خط کے جواب میں مولانا مرحوم نے فرمایا:-

برادر مکرم و محترم!

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ سے مشرف و ممنون ہوا۔ یاد فرمائی کا شکریہ۔ ایک طالب علم کا داخلہ فارم بھی ملا۔ آپ نے اپنے عام اصول کے خلاف اس کے داخلہ کی پر زور سفارش فرمائی ہے۔ آپ کی سفارش اور موثر نہ ہو، اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مگر ایک پالیسی جس کا اعلان بھی کر دیا گیا ہے داخلہ میں مانع ہے۔ اس پالیسی کی تشریح یہ ہے کہ..........

یہی پالیسی اور اعلان ہے جو داخلہ میں حارج ہے۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ میں داخلہ لینے سے قاصر و معذور ہوں۔ اس کے لئے آنجناب سے عفو کا خواستگار ہوں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عبدالمجید ندوی ۲۹ شوال ۱۴۱۱ھ

وہ مدرسۃ الاصلاح کے بہت ہی بے غرض اور مخلص خادم تھے۔ انھیں مدرسہ سے بے پناہ محبت تھی۔ مدرسہ ہمیشہ ان کے دل و دماغ پر طاری رہتا۔

وہ مدرسہ کے موجودہ حالات اور موجودہ معیارِ تعلیم سے مطمئن نہ تھے۔ اور اس بے اطمینانی کا اظہار وہ بڑے کرب کے ساتھ کیا کرتے۔ انھیں مدرسہ کے بنیادی نصب العین اور اس کے مقصد تاسیس سے بڑا پیار تھا۔ اس نصب العین کے حصول اور اس مقصد کی تکمیل کے وہ ہمیشہ آرزومند رہتے۔ وہ برابر خود بھی ان مسائل پر سوچا کرتے اور مدرسہ کے ذمہ داروں اور خیر خواہوں کو بھی جھنجھوڑتے رہتے۔

وہ کبھی اس پر اپنی طبیعت کو مطمئن نہ کر سکے کہ مدرسۃ الاصلاح عام مدرسوں کی طرح کا کوئی مدرسہ، یا عام تعلیمی مراکز کی طرح کا کوئی تعلیمی مرکز ہے۔ وہ اسے ایک زبردست علمی اور دینی تحریک کا نام دیا کرتے۔ ان کی نگاہ میں مدرسۃ الاصلاح کی حیثیت بالکل ویسی ہی تھی، جیسے صحرا میں کوئی پھول ہو، یا ریگستان میں کوئی نخلستان ہو، یا بیابان کی شب تاریک میں کوئی قندیل ہو۔

آہ! اس پھول سے، یا اس نخلستان سے یا اس قندیل سے انھیں کتنی محبت تھی، اس کو بیان کرنا مشکل ہے۔ بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ اس قندیل میں انہوں نے اپنے جسم کا پورا تیل نچوڑ دیا تھا، اس نخلستان کو شاداب رکھنے کے لئے انہوں نے اپنا خون پسینہ ایک کر دیا تھا۔ اس پھول کو تر و تازہ رکھنے کے لئے انہوں نے خود اپنے آپ کو فنا کر دیا تھا۔ اور اس کے پیچھے وہ اپنے گھر در اور اپنے کاروبار تک کو بھول چکے تھے۔

اور ادھر آخری ایام میں تو ان کی یہ فنائیت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہی جا رہی تھی، اور وہ رات و دن اسی فکر میں گھلا کرتے تھے۔ ان کے اس دردِ پنہاں اور کربِ مسلسل کی تصویر کھینچی جائے تو بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت ان کی رگوں میں لہو نہیں بجلیاں دوڑ رہی تھیں۔ اور ان کا پورا وجود ایک آہ سوزاں اور ایک قلب بریاں بن کر رہ گیا تھا۔

پھر چونکہ جامعۃ الفلاح بھی اپنے مقاصد اور اپنے نظریۂ تعلیم میں مدرسۃ الاصلاح کا ہی ہم ذوق و ہم مشرب ہے، اس لئے جامعۃ الفلاح سے بھی انہیں ویسی ہی محبت

تھی جیسی مدرسۃ الاصلاح سے ۔ وہ جامعۃ الفلاح تشریف لاتے تو بڑی خوشی و مسرت کا اظہار فرماتے ۔ اور اس کے ذرے ذرے میں آنکھوں کی ٹھنڈک محسوس کرتے ۔

آہ! کتنی پیاری اور دلربا شخصیت تھی جو آج ہم سے جدا ہو گئی ۔

آہ! کیا قیمتی ہیرا تھا جو آج ہم سے چھین گیا ۔

آہ! ابھی چند ماہ پہلے کی بات ہے کہ ہمیں ایک زبردست جھٹکا لگا تھا ۔ ہمیں اپنے محسن و زیرک رہنما مولانا ابو اللیث صاحب اصلاحی ندوی کا غم اٹھانا پڑا تھا ۔

آہ! ابھی ہمارے آنسو خشک بھی نہ ہوئے تھے ۔ اور ہمارا وہ زخم مندمل نہ ہوا تھا ، کہ آج ایک دوسرا زبردست جھٹکا لگا ، جس نے ہمیں بالکل توڑ کر رکھ دیا ۔

آہ! مولانا عبد المجید صاحب ندوی اصلاحی کا جانا کسی ایک فرد کا جانا نہیں ہے ۔ بلکہ ان کے جانے سے ہمارے آسمانِ مجد و شرف کا ایک تابندہ ستارہ غروب ہو گیا ۔

آہ! ابھی اس ستارۂ مجد و شرف کے ہم سخت ضرورت مند تھے ۔ ابھی اس کی رہنمائی و ضیاباری کے ہم شدید محتاج تھے ۔ ابھی اس کی تابندہ شعاعوں سے اپنے بہت سے تاریک گوشوں کو روشن کرنا تھا ۔ ابھی اس کی ظلمت سوز کرنوں سے بہت سے اندھیروں کو بھگانا تھا ۔

آہ! ہمیں کیا معلوم تھا کہ یہ ستارہ اتنی جلد غروب ہو جائے گا ، اور ہم اپنی غفلتوں پر اس طرح کفِ افسوس ملتے رہ جائیں گے ۔

آہ! مولانا عبد المجید ، ہمارے عز و شرف کے نشان ، ہمارے مجد کہن کے نگہبان آپ پر جاتے جاتے ہماری طرف سے ہزاروں سلام ۔

آہ! آج مدرسۃ الاصلاح کے در و دیوار اپنے اس معمار کے لئے سوگوار ہیں ۔ آج وہاں کے گل و گلزار اپنے مالی کے غم میں اشکبار ہیں ۔ آج وہاں کی محفلیں خاموش ہیں کہ جانِ محفل نہیں رہا ۔ آج وہ میکدہ اداس ہے کہ پیر میکدہ چلا گیا ۔

آج وہاں کا چپہ چپہ غمزدہ اور وہاں کا بچہ بچہ بے قرار ہے ۔

آج ہر ایک کے دل کی ایک ہی آواز ہے ! خدایا ، کتنی بڑی نعمت تھی جو ہم

بقیہ صفحہ ۱۰۹ پر